تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

مارچ ۲۰۲۲ء

جلد ۲

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۴

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبالؔ

مَن يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	لَوح بھی تُو، قلم بھی تُو	علامہ اقبالؔ	۴
اداریہ	رمضان: نیکیوں اور مغفرت کا مہینا	مدیر	۵
درسِ قرآن	ماہِ صیام اور قرآن	مولانا محمد اقبال	۸
درسِ حدیث	استقبالِ رمضان	ابنِ عباس	۱۱
مقالات	حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۲)	مولانا نایاب حسن قاسمی	۱۶
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۹)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۲۵
مقالات	سفرنامۂ ترکی (۲)	مولانا حماد احمد ترکؔ	۳۳
مقالات	امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۱)	محمد عثمان خان	۴۰
یسئلونک	رخصتی سے قبل ولیمہ کرنے کی شرعی حیثیت	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۵
ادبیات	سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چند غیر منقوط کتب	تبسم فاطمہ	۴۷
ادبیات	غزل: تھا جانبِ دل صبح دم	احمد جاویدؔ	۵۰

علامہ اقبالؔ (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء)
عظیم مفکرِ اسلام، معروف شاعر

لَوح بھی تُو، قلم بھی تُو

لَوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گُنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حَباب
عالَمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تُو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجؔر و سلیمؔ تیرے جلال کی نمود
فقرِ جُنیدؔ و بایزیدؔ تیرا جمالِ بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

*****

مدیر
ماہنامہ مفاہیم، کراچی

رمضان: نیکیوں اور مغفرت کا مہینا

غزوۂ حنین میں کسی صحابی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ثقیف کے خلاف بددعا کریں تو رحمتِ محمدی کو یہ گوارا نہ ہوا بلکہ یوں دعا کی: «اَللّٰهُمَّ اهْدِ ثَقِيفًا» ”اے اللہ! قبیلہ ثقیف کو ہدایت دے“۔ لیکن یہی رسولِ رحیم علیہ السلام رمضان میں مغفرت نہ کرا سکنے والے کو تباہی کی بددعا کے ساتھ، جبریل علیہ السلام کی دعاے پھٹکار پر آمین بھی فرماتے ہیں تو سوچو کتنی بڑی بدنصیبی اور کتنا بڑا جرم ہے کہ نیکیوں کے موسمِ بہار اور نیکیوں کے بازار سے ”خریدار نہیں ہوں“ کی شانِ متکبرانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے گزرا جائے۔ رسولِ خدا ﷺ نے رمضان کی آمد پر کس کس طرح سے متوجہ کیا۔ کہیں تو فرمایا کہ اس میں آسمانوں کے دروازے کھول دیے جاتے اور کہیں فرمایا اس میں جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور حینِ رمضان کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ دوزخ کے دروازے اس طرح بند کر دیے جاتے ہیں کہ کوئی دروازہ کھولا نہیں جاتا۔ سرکش شیطان پابندِ سلاسل کر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح نیکی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ نیکی کرنا اسی طرح آسان ہو جاتا ہے جس طرح موسمِ بہار میں پھلنا پھولنا اور پھر آوازیں لگوائی جاتی ہیں: ”اے نیکی کے چاہنے والے! آگے بڑھ“۔ تو جب نیکیوں کا موسم یہ سماں باندھ لے تو پھر اعمال کی محنت کے علاوہ کوئی دوسرا کام جچتا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «افْعَلُوا الْخَيْرَ دَهْرَكُمْ، وَتَعَرَّضُوا لِنَفَحَاتِ رَحْمَةِ اللهِ، فَإِنَّ لِلَّهِ نَفَحَاتٍ مِنْ رَحْمَتِهِ يُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ» ”اپنے وقتوں میں نیکیاں کیا کرو اور اس طرح رحمتِ الٰہی کے جھونکوں کا سامنا کرو پس بے شک اللہ کی رحمت کی گھٹائیں چلتی ہیں جو وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے“۔ ایک روایت میں مزید امید دلائی گئی: «لَعَلَّ أَحَدَكُمْ أَنْ يُصِيبَهُ مِنْهَا نَفْحَةٌ لَا يَشْقَى بَعْدَهَا أَبَدًا» ”شاید تم میں سے کسی پر اس بادِ صبا

کا گزر ہو جائے تو اس کی بدبختی ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے"۔(مجمع الزوائد) تو بہارِ رمَضانی کے جھونکے سے اپنے اعمال نامے کی کھیتیاں لہلہانے کے لیے بازوے عمل کی آستینیں چڑھالینی چاہیے، "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے" کے مطابق محنت کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ابھی تو ہم نے سردیوں کے بے مشقت چھوٹے چھوٹے سرمائی دن گزارے ہیں اور لمبی لمبی سرمائی راتوں کی بے تکان استراحتوں کے مزے لوٹے ہیں۔ابھی تو ہم تازہ دم ہیں اس لیے رمضان کی برکات کے حصول کے لیے محنتِ شاقہ کا عزم پختہ کر لینا چاہیے۔رمضان کی برکات کے حصول کی دو لازمی شرطیں 'آداب و معمولات' ہیں۔آداب سے شروع کرتے ہیں تو معروف بات ہے کہ صرف کھانے اور پینے سے رکنے کا نہیں بلکہ فضولیات اور بے ہودہ کاموں سے رکنے کا نام روزہ ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی حدود کو پہچانا اور اس کی حدود و آداب کی محافظت کی تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سمع و بصر اور زبان کو محارم سے روزہ رکھوا، پڑوسی کو تکلیف دینے سے اجتناب کر اور شور شرابے سے الگ ہو کر سکینت اور وقار کا راستہ اختیار کر، تو روزے کے آداب کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ بعض روزے داروں کو روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔رمضان کے معمولات کی طرف آئیں تو سب سے اہم چیز تعلق مع القرآن ہے۔اس ضمن میں تراویح سے آگے بڑھ کر تلاوتِ قرآن کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔اسلاف کا رمضان میں تلاوتِ قرآن کا شوق دیدنی ہوتا تھا۔جب رمضان شروع ہوتا تو امام مالک رحمہ اللہ تمام کام چھوڑ کر تلاوتِ قرآن کی طرف متوجہ رہتے اور حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ بھی ایسا ہی کیا کرتے۔امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ رمضان میں ساٹھ دور مکمل کیا کرتے تھے۔امام بخاری رحمہ اللہ رمضان میں ہر دن ایک قرآن ختم کرتے تھے۔بعض لوگ قرآنِ کریم کی درس و تدریس کی جانب متوجہ ہوتے۔حضرت قتادہ رحمہ اللہ رمضان میں قرآنِ کریم کی درس و تدریس کا خاص اہتمام کیا کرتے۔عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب بصرہ کے امیر تھے تو وہ لوگوں کو جمع کرتے اور انھیں فقہ کی تعلیم دیا کرتے۔بعض سلَف رمَضانِ کریم میں حدیث شریف سے لو لگاتے۔شیخ حسن بن محمد الشافعی کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ہر سال رمضان میں صحیح بخاری کا حفظ برقرار رکھنے کے لیے اس کا ختم کرتے تھے۔نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی سخاوت رمضان میں اپنے عروج پر ہوا کرتی، لہٰذا نفلی صدقہ و خیرات کا رمضان میں بہت اہتمام کرنا چاہیے۔اس لیے کہ اس ماہ میں نفل کا اجر فرض کے برابر دیا جاتا

ہے اور کسی روزے دار کو افطار کرانے پر، روزہ رکھنے والے کے برابر اجر دیا جاتا ہے چاہے یہ افطار ایک گھونٹ پانی یا لسی پہ کیوں نہ ہو اور رہی یہ بات کہ کوئی کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے تو اسے دوزخ سے نجات کی بشارت دی گئی ہے۔ امام ابنِ شہاب زہری رحمہ اللہ رمضان میں لوگوں کو کھانا کھلانے کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر شام کسی مسکین کو افطار کرایا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد میں کھانا رکھوا دیا کرتے کہ یہ عبادت میں مشغول لوگوں کی سہولت کے لیے ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے استاد حماد بن ابی سلیمان رحمہ اللہ ہر شام پچاس بندوں کو افطار کرایا کرتے اور جب عید الفطر کی (یعنی چاند) رات ہوتی تو ہر ایک کو کپڑوں کا ایک جوڑا بھی عنایت کرتے۔ رمضان کا ایک اہم کام ذکر اللہ میں محنت کرنا ہے اس لیے کہ ذکر کی برکت سے روزے کا اجر بھی بڑھا دیا جاتا ہے اور رمضان کی برکت سے خود ذکر کا اجر بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان کا ایک اہم کام دعا ہے اس لیے کہ رمضان میں افطار اور سحر کے علاوہ حالتِ صیام میں بھی دعائیں خاص طور پر قبول کی جاتی ہیں۔ اسی طرح ختمِ قرآن کے موقعے پر بھی دعا کی خاص فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں رمضان مبارک میں چار کاموں کی ترغیب وارد ہوئی ہے: کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ کا ورد، استغفار کا اہتمام، جنت کا سوال اور دوزخ سے پناہ مانگنا، تو ان امور کا اہتمام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ رمضان کے آخری عشرے میں نبی اکرم ﷺ رمضان کے ابتدائی دنوں سے زیادہ محنت کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ آخری عشرے کی راتوں کو زندہ رکھتے اور تمام اہلِ خانہ کو بھی جگایا کرتے تھے۔ ان دنوں میں اعتکاف کرنا اور لیلۃ القدر کو تلاش کرنا بھی ایک اہم کام ہے۔ یہ ہے رمضان کی جان توڑ محنت جس کے بعد جب رمضان کی آخری رات آتی ہے تو مسلمانوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے اور انھیں یہ اصول بتایا جاتا ہے: العامل إنما یوفی أجره إذا قضی عمله "مزدوری کرنے والا جب کام ختم کرلے تو اس کو اجر دیا جاتا ہے"۔ پھر جب وہ عید گاہ کی طرف چلتے ہیں تو مغفورا لھم کی سند سے انھیں نوازا جاتا ہے۔ بقول ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، فرشتے راستوں میں کھڑے ہو کر ایسی آواز لگاتے ہیں جنھیں جن و انس کے سوا سب سن سکتے ہیں: "اے امتِ محمد! چلو، چلو اپنے ربِّ کریم کی بارگاہ میں جو تمھیں اجرِ جزیل اور مغفرتِ عظیم سے نوازے گا۔ دعا ہے کہ اللہ ہمیں رمضان کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور نبی کریم اور جبریلِ امین علیہما السلام کی بددعا سے محفوظ رکھے۔ آمین

*****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

ماہِ صیام اور قرآن

سورۂ بقرہ آیت:۱۸۵

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ، يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ، وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

”رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دیتی ہیں۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی یہ مہینا پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔ اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔ اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اور تمھارے لیے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا، تاکہ (تم روزوں کی) گنتی پوری کر لو اور اللہ نے تمھیں جو راہ دکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو اور تاکہ تم شکر گزار بنو“۔

تفسیر

دینِ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انسان کو محض اس بات کا پابند نہیں کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور صرف ایک مافوق الفطرت ہستی کے وجود کا اعتراف کر کے اس پر اکتفا کرے۔ بلکہ یہاں معاملہ یہ ہے کہ عملی طور پر انسان کو یہ دکھانا ضروری ہے کہ جس پروردگار کے خالق و مالک ہونے پر اسے یقین ہے اس کے سامنے اپنی بندگی کا ثبوت بھی

فراہم کرے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے عبادات کا ایک ایسا نظام دیا ہے کہ اس سے قول اور فعل میں یکسانیت پیدا ہو اور بندگی کا دعویٰ محض دعویٰ نہ رہے۔ عبادات کے اس نظام کا ایک اہم رکن ماہِ صیام کے روزے بھی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو باقی عبادات کی بنسبت روزہ ہی ایک ایسا عمل ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور اس میں دکھاوے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ. (صحیح ابنِ خزیمۃ) ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا''۔ یعنی باقی عبادات میں ریا اور سمعہ (دکھاوے) کا امکان موجود ہے، ہو سکتا ہے کوئی شخص نمازِ باجماعت کا اہتمام اس لیے کرتا ہو کہ خدانخواستہ اسے عبادت گزار سمجھ لیا جائے اور اسی طرح دوسری تمام عبادات میں سوائے روزے کے دکھاوے کا امکان موجود رہتا ہے۔ جبکہ روزے میں یہ ممکن ہی نہیں ہے اس لیے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کسی گوشے میں کھانا پینا کوئی مشکل نہیں، مگر پھر بھی روزہ برقرار رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے ہے۔ لہٰذا عبادات میں ماہِ صیام کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں تاکہ انسان کے اندر تقویٰ پیدا ہو اور وہ خواہشاتِ نفس کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت سے متّصف ہو جائے۔ آیتِ مبارکہ میں فرمایا گیا کہ تم میں سے جو شخص یعنی ہر بالغ مسلمان یہ مہینا پائے تو وہ اس میں ضرور روزہ رکھے۔ اور اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے۔

ماہِ صیام خیر و صلاح اور نیکیوں کا گویا موسمِ بہار ہے، اس مبارک مہینے کے آتے ہی اسلامی معاشرے میں خیر کے کاموں میں بیش بہا ترقی دیکھنے میں آتی ہے۔ چنانچہ اس مہینے کی بڑی برکتیں اور بڑے فضائل احادیثِ مبارکہ میں موجود ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد نقل کرتے ہیں: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا كَانَ أَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّيَاطِينُ، وَمَرَدَةُ الجِنِّ، وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ، وَفُتِّحَتْ أَبْوَابُ الجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ، وَيُنَادِي مُنَادٍ: يَا بَاغِيَ الخَيْرِ أَقْبِلْ! وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ أَقْصِرْ! وَلِلَّهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ، وَذَلِكَ كُلُّ لَيْلَةٍ» (سنن الترمذي) ''حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب ماہِ رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جنوں کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی

دروازہ کھولا نہیں جاتا۔ جنت کے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، پس ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ اور ایک ندا دینے والا پکارتا ہے: اے طالبِ خیر! آگے آ اور اے شر کے متلاشی! رک جا! اللہ تعالیٰ کے حکم سے لوگوں کو جہنم سے آزادی کا پروانہ مل جاتا ہے اور ماہِ رمضان کی ہر رات یہی سلسلہ جاری رہتا ہے"۔

رمضان اور قرآن

اس آیتِ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ﴾ "رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے سراپا ہدایت اور ایسی روشن نشانیوں کا حامل ہے جو صحیح راستہ دکھاتی اور حق و باطل کے درمیان دوٹوک فیصلہ کر دیتی ہیں" ۔ یعنی قرآن کے نزول کا مہینا یہی مبارک مہینا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "قرآن کریم لوحِ محفوظ سے شبِ قدر ماہِ صیام میں بیت العزّۃ سے آسمانِ دنیا کی طرف یک بارگی نازل کیا گیا، پھر جبریلِ امین علیہ السلام تئیس سال کی مدت میں رسول اللہ ﷺ پر اتارتے رہے"۔ (معالم التنزيل في تفسير القرآن، تفسير البغوي) لہٰذا قرآن کریم کا اس مہینے کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ " اور اللہ نے تمھیں جو راہ دکھائی اس پر اللہ کی تکبیر کہو اور تاکہ تم شکر گزار بنو"۔ یعنی وہ نعمتِ عظمیٰ اور راہِ ہدایت جو قرآنِ کریم کی شکل میں تمھیں دی گئی ہے تم اس پر شکر ادا کرو۔ ماہِ صیام کے دنوں میں روزہ رکھو اور اس کی راتوں کو تراویح میں کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کا کلام سنو اور اس کی تلاوت کرو تاکہ تمھارے اندر ضبطِ نفس کی صلاحیت پیدا ہو اور تم اپنے اندر تقویٰ کا جوہر پیدا کر کے باطن کو روحانیت اور پاکیزگی سے متّصف کرو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آنے والے ماہِ صیام میں ہمیں اپنی رضا کے مطابق اس کے تقاضوں کی تکمیل کی توفیق بخشیں اور اس مبارک مہینے کی روحانیت اور نورانیت سے ہمیں مالامال فرمائیں۔ آمین

* * * *

ابنِ عباس
معاون قلم کار

استقبالِ رمضان

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ، قَالَ: خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي آخِرِ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ فَقَالَ: «يا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، شَهْرٌ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ، جَعَلَ اللهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً، وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا، مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ، وَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيهِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ»

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ میں ہمارے سامنے وعظ کیا اور فرمایا: ”اے لوگو! تم پر ایک عظیم مہینا اپنا سایہ کرنے والا ہے۔ یہ بڑی برکت والا مہینا ہے، اِس میں ایک رات ہے (شبِ قدر) جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے، اللہ تعالیٰ نے اِس کے روزے فرض جب کہ اِس کی راتوں کا قیام (یعنی تراویح) کو سنت بنایا ہے۔ جو شخص اِس مہینے میں کسی نفل نیکی کے ساتھ اللہ کا قُرب حاصل کرے گویا اس نے غیرِ رمضان میں فرض ادا کیا اور جو شخص اِس مہینے میں کوئی فرض ادا کرے وہ ایسا ہے گویا اس نے غیرِ رمضان میں ستَّر فرض ادا کیے“۔

«وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ، وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ، وَشَهْرٌ يُزَادُ فِي رِزْقِ الْمُؤْمِنِ، مَنْ فَطَّرَ فِيهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوبِهِ، وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ، وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُنْقَصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ» قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، لَيْسَ كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفْطِرُ الصَّائِمَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:

”یہ مہینا صبر کا ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے اور یہ باہمی ہمدردی اور غم خواری کا مہینا ہے۔ اِس مہینے میں مومن کا رِزق بڑھا

دیا جاتا ہے۔ کسی روزے دار کا روزہ اِفطار کرانا گناہوں کی مُعافی اور دوزخ سے خَلاصی کا ذریعہ ہے۔ افطار کرانے والے کو روزے دار کے ثواب کے برابر ثواب دیا جائے گا، البتہ روزے دار کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا"۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: یارسولَ اللہ! ہم میں سے ہر شخص تواتنی وُسعت نہیں رکھتا کہ روزے دار کو اِفطار کرائے، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«يُعْطِي اللهُ هَذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلَى مَذْقَةِ لَبَنٍ أَوْ تَمْرَةٍ أَوْ شَرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ، وَمَنْ أَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللهُ مِنْ حَوْضِي شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتَّى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ، وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ، وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ مَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوكِهِ فِيهِ غَفَرَ اللهُ لَهُ وَأَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ»

"(یہ اجر پیٹ بھر کھلانے پر مَوقُوف نہیں) یہ ثواب اللہ جَلَّ شَانُہٗ اس کو بھی دے گا جو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی یا ایک گھونٹ لَسّی پر افطار کرادے۔ اور جو کوئی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلادے تو اللہ اسے میرے حوض سے پلائے گا، پھر جنت میں داخلے تک اسے پیاس نہ لگے گی۔ اس مہینے کا اوّل حصّہ اللہ کی رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفِرت ہے، اور آخری حصہ آگ سے آزادی کا ہے۔ جو شخص اِس مہینے میں اپنے غلام (یا خادم) پر سے بوجھ ہلکا کردے حق تَعالیٰ شَانُہٗ اُس کی مغفرت فرماتے ہیں اور آگ سے آزاد فرماتے ہیں"۔

«فَاسْتَكْثِرُوا فِيهِ مِنْ أَرْبَعِ خِصَالٍ، خَصْلَتَانِ تُرْضُونَ بِهَا رَبَّكُمْ، وَخَصْلَتَانِ لَا غِنَى لَكُمْ عَنْهُمَا، فَأَمَّا الْخَصْلَتَانِ اللَّتَانِ تُرْضُونَ بِهَا رَبَّكُمْ: فَشَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَتَسْتَغْفِرُونَهُ، وَأَمَّا اللَّتَانِ لَا غِنَى لَكُمْ عَنْهُمَا فَتَسْأَلُونَ اللهَ الْجَنَّةَ، وَتَعُوذُونَ بِهِ مِنَ النَّارِ» شعب الإيمان للبيهقي

"چار کاموں کی اِس مہینے میں کثرت کیا کرو، جن میں دو چیزیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ضروری ہیں اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بغیر تمھارا گزارا نہیں ہو سکتا: رب کو راضی کرنے والی چیزیں کلمہ طَیِّبہ کا ورد اور اِستغفار کی کثرت ہے، اور دوسری دو چیزیں حصولِ جنت کی دعا اور دوزخ سے نجات طلب کرنا ہے"۔

فوائد: شعبان کے آخری دن میں رمضان کی عظمت بیان کرنے سے نبی اکرم ﷺ کا اہتمامِ رمضان معلوم ہوتا ہے۔ یہ برکت کا مہینا ہے یعنی اس میں نیکیوں کے مواقع اور اس کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ ماہِ رمضان کی برکتوں کا عروج شب قدر

ہے جس کی عبادت کا ثواب ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ انسان کو شروع رمضان ہی سے شب قدر کو پانے کی نیت کر لینی چاہیے۔ رمضان کا قِیام یعنی تراویح کی مشروعیت کو اس روایت میں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا۔ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ نے تراویح کی مشروعیت وسنیت کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اس سے تاکید مزید مطلوب ہے اور یہ بھی کہ اگرچہ تراویح کے مسنون ہونے کا بیان نبی کریم ﷺ نے واضح کیا ہے لیکن چوں کہ شارعِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں تو اس کی نسبت دونوں کی طرف جائز ہے۔ نبی کریم ﷺ قیامِ رمضان کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس نے رمضان کی راتوں کا قیام کیا تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اہل سنت کے تمام مسالک تراویح کے سنت ہونے پر متفق ہیں۔ یہاں خُصوصِیت سے ایک بات کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ قرآن شریف کا تراویح میں پڑھنا یا سننا یہ مستقل سنت ہے اور پورے رَمَضان شریف کی تراویح ادا کرنا مُستقِل سنَّت ہے۔ بعض لوگ کسی مسجد میں آٹھ دس دن میں کلامِ مجید سن لیتے ہیں پھر وہ تراویح پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ اس سے ایک سنت پر عمل رہ جاتا ہے۔ البتہ جن لوگوں کو رَمَضانُ المبارک میں سفر یا کسی وجہ سے ایک جگہ روزانہ تراویح پڑھنی مشکل ہو، اُن کے لیے مناسب ہے کہ اوَّل مکمل قرآن شریف کچھ روز میں سن لیں تاکہ قرآن شریف ناقِص نہ رہے پھر جہاں وقت اور موقع ملے وہاں تراویح پڑھ لیا کریں۔ اس طرح دونوں سنتوں پر عمل ہو جائے گا۔

اجر کی زیادتی: رمضان میں فرض کا اجر ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے اس لیے فرض نماز کی باجماعت ادائی کا خاص اہتمام کرنا چاہیے بالخصوص نمازِ فجر اور نمازِ مغرب کا خاص خیال کرنا چاہیے کہ بعض اوقات فجر سحری کے بعد کے آرام اور مغرب افطاری کی نذر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سننِ موکدہ وغیر موکدہ اور نوافل کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

صبر کا مہینا: یہ صبر کا مہینا ہے، یعنی اگر روزے وغیرہ میں کچھ تکلیف ہو تو اُسے ذوق شوق سے برداشت کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ مار دھاڑ، ہَول پُکار شروع کر دی جائے۔ رمضان کو غم خواری کا مہینا قرار دیا گیا۔ اس لیے اس مہینے میں غُربا اور مَساکین کے ساتھ مُدارات کا برتاؤ کرنا اور جس قدر بھی ہِمَّت ہو سکے اپنے اِفطار و سَحر کے کھانے میں غُربا کا حصہ بھی ضرور لگانا چاہیے۔ اِس کے بعد حضور ﷺ نے روزہ افطار کرانے کی فضیلت ارشاد فرمائی۔ ایک اَور روایت میں ہے: جو شخص حلال کمائی سے

رَمضان میں روزہ افطار کرائے اُس پر رمَضان کی راتوں میں فرشتے رحمت بھیجتے ہیں، اور شبِ قدر میں جبرئیل اُس سے مُصافحہ کرتے ہیں، اور جس سے حضرت جبرئیل مصافحہ کرتے ہیں (اُس کی علامت یہ ہے کہ) اُس کے دِل میں رِقَّت پیدا ہوتی ہے، اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ حمَّاد بن سَلمہ رحمہ اللہ-ایک مشہور مُحدِّث ہیں-روزانہ پچاس آدمیوں کے روزہ افطار کرانے کا اہتمام کرتے تھے۔ افطار کی فضیلت کے بعد فرمایا: اِس ماہ کا اوَّل حصّہ رحمت ہے، یعنی: حق تعَالیٰ شَانُہٗ کا اِنعام مُتوجّہ ہوتا ہے، اور یہ رحمتِ عامّہ سب مسلمانوں کے لیے ہوتی ہے، اِس کے بعد جو لوگ اِس کا شکر ادا کرتے ہیں اُن کے لیے اِس رحمت میں اِضافہ ہوتا ہے: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اور اِس کے درمیانی حصے سے مغفرت شروع ہوجاتی ہے؛ اِس لیے کہ روزوں کا کچھ حصہ گزر چکا ہے، اُس کا مُعاوَضہ اور اِکرام مغفرت کے ساتھ شروع ہوجاتا ہے، اور آخری حصّہ تو بالکل آگ سے خَلاصی ہے ہی۔ اَور بھی بہت سی رِوایات میں ختمِ رمَضان میں آگ سے خَلاصی کی بشارتیں وَارِد ہوئی ہیں۔ رمَضان کے تین حِصے کرنے میں یہ اس معنیٰ کا احتمال بھی ہے کہ آدمی تین طرح کے ہیں: ایک وہ لوگ جن کے اوپر گناہوں کا بوجھ نہیں، اُن کے لیے شروع ہی سے رحمت اور انعام کی بارش ہوجاتی ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو معمولی گنہگار ہیں، اُن کے لیے کچھ حصہ روزہ رکھنے کے بعد اُن روزوں کی برکت اور بدلے میں مغفرت اور گناہوں کی مُعافی ہوتی ہے۔ تیسرے وہ جو زیادہ گنہگار ہیں، اُن کے لیے زیادہ حصہ روزہ رکھنے کے بعد آگ سے خَلاصی ہوتی ہے، اور جن لوگوں کے لیے ابتدا ہی سے رحمت تھی اور اُن کے گناہ بخشے بخشائے تھے، اُن کا تو پوچھنا ہی کیا! کہ اُن کے لیے رحمتوں کے کس قدر اَنبار ہوں گے!! اِس کے بعد حضور ﷺ نے ایک اَور چیز کی طرف رَغبت دِلائی ہے، کہ آقا اپنے مُلازِموں یا غلاموں پر اِس مہینے میں تَخفیف کریں؛ اِس لیے کہ آخر وہ بھی روزے دار ہیں، کام کی زیادتی سے اُن کو روزے میں دِقّت ہوگی۔

اِس کے بعد نبی کریم ﷺ نے رمَضانُ المبارک میں چار چیزوں کی کثرت کا حکم فرمایا: اوَّل: کلمۂ شہادت، احادیث میں اِس کو اَفضلُ الذِّکر قرار دیا گیا ہے، مشکوٰۃ میں بروایتِ ابوسعید خُدری منقول ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ: یا اللہ! تُو مجھے کوئی ایسی دعا بتلادے کہ اُس کے ساتھ مَیں تجھے یاد کیا کروں اور دعا کیا کروں، وہاں سے لا الہ الا اللہ ارشاد ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یہ کلمہ تو تیرے سارے ہی بندے کہتے ہیں، مَیں تو کوئی دعا یا ذکرِ مخصوص

چاہتا ہوں، وہاں سے ارشاد ہوا: اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور اُن کے آباد کرنے والے میرے سِوا یعنی ملائکہ اور ساتوں زمین ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں اور دوسرے میں کلمہ ٔطیبہ رکھ دیا جائے تو وہ جھک جائے گا۔ ایک حدیث میں وارد ہوا: جو شخص اخلاص سے اِس کلمے کو پڑھے آسمان کے دروازے اُس کے لیے فوراً کُھل جاتے ہیں، اور عرش تک پہنچنے میں کسی قِسم کی رَوک نہیں ہوتی بہ شرطیکہ کہنے والا کبائر سے بچے۔ دوسری چیز جس کی کثرت کرنے کو حدیثِ بالا میں ارشاد فرمایا گیا وہ اِستغفار ہے، احادیث میں اِستغفار کی بھی بہت ہی فضیلت وارد ہوئی ہے: ایک حدیث میں ہے: جو شخص استغفار کی کثرت رکھتا ہے حق تعالیٰ شَانُہٗ ہر تنگی میں اُس کے لیے راستہ نکال دیتے ہیں، اور ہر غم سے نجات نصیب فرماتے ہیں، اور اسے اس طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ اُس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا: آدمی گنہگار تو ہوتا ہی ہے، گناہ گاروں میں بہترین وہ ہے جو توبہ کرتا رہے۔ ایک حدیث میں ہے: جب آدمی گناہ کرتا ہے تو ایک کالا نقطہ اُس کے دِل پر لگ جاتا ہے، اگر توبہ کرتا ہے تو وہ دُھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے۔ اِس کے بعد حضور ﷺ نے دو چیزوں کے مانگنے کا اَمر فرمایا ہے جن کے بغیر چارہ ہی نہیں: جنت کا حُصول اور دوزخ سے نجات۔ ہماری تمام عبادت و ریاضت کا محور یہی دو چیزیں، جنت کی فلاح اور دوزخ سے نجات۔ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) "پس جو دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا وہ کامیاب ہو گیا"۔ تو رمضان کی تمام تر محنت کے بعد اس کا حاصل، دوزخ سے نجات اور جنت کی فلاح کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: " اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَارْضَ عَنَّا وَتَقَبَّلْ مِنَّا وَأَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَنَجِّنَا مِنْ النَّارِ وَأَصْلِحْ لَنَا شَأْنَنَا كُلَّهُ» "اے اللہ! ہماری مغفرت فرما، ہم پر رحمت فرما، ہم سے راضی ہو جا، ہماری دعائیں قبول فرما، ہمیں جنت میں داخل فرما، ہمیں جہنم سے نجات دے اور ہمارے سارے کام سنوار دے"۔ ہم نے مزید دعا کے لیے خواہش کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا میں نے تمھارے لیے سب کچھ جمع نہیں کردیا؟"۔ (تمام روایات، فضائلِ اعمال از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں)

٭٭٭٭

مولانانایاب حسن قاسمی
رکن شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند

حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۲)

مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا ایک جامع تعارف

مکتوباتِ شیخ الاسلام

یہ چار جلدوں پر مشتمل آپ کے خطوط کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے معتقد و معتمدِ خصوصی مولانا نجم الدین اصلاحی نے مرتب کیا ہے، یہ مکتوبات متنوع معلومات کا گنج شائگاں ہیں اور ان سے آپ کی بلند و بالا شخصیت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کی ذات اسلامی فضائل اور دینی اوصاف و کمالات کی جامعیت کے لحاظ سے اپنے دور میں ایک بے مثال شخصیت کی حیثیت رکھتی تھی، آپ اسلامی و عربی علوم و فنون، سلوک و معرفت اور تصوف و سلوک کے ایک ناپیدا کنار سمندر تھے۔ قدرت نے آپ کے اندر علم و عمل کی جملہ خوبیاں جمع کردی تھیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مکتوبات میں ان کی جھلکیاں بھرپور انداز میں پائی جاتی ہیں، یہ خطوط وہ ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں اپنے مریدین، معتقدین، دوستوں، عزیزوں، رشتے داروں اور شاگردوں کو لکھے ہیں، ان خطوط کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک حصہ تو ان خطوط کا ہے، جن میں علمی، دینی یا معاشرتی سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ آپ کے دوست، اعزہ اور نیاز مند اکثر کسی نہ کسی مسئلے میں آپ کی رہ نمائی کے خواہاں ہوتے اور آپ کو خط لکھا کرتے تھے، آپ ان کے خطوط کو اولاً انتہائی توجہ سے پڑھتے اور پھر حسبِ حال انھیں ان کے سوالات کے جوابات لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے، آپ کے زیادہ تر خطوط ایسے ہی ہیں اور یہ بات بلا کسی شبہے کے کہی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کی علمیت اور وسعتِ نظری کا اعلیٰ

نمونہ ہیں، ان خطوط کو دیکھ کر کوئی بھی انسان آپ کی معلومات کی کثرت اور علم وفضل کی بے کرانی کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ان میں تفسیر و حدیث، فقہ وفتاویٰ، علم کلام و عقائد، سلوک و معرفت، تاریخ وسیر اور اقتصادیات واخلاقیات کے ٹھوس حقائق پر سیر حاصل اور بصیرت افروز گفتگو کی گی ہے اور کمال تو یہ ہے کہ اکثر وبیشتر خطوط دورانِ سفر یا ایامِ اسیری میں انتہائی عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں؛ مگر اس کے باوصف وہ مستقل مضمون اور علمی و تحقیقی شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب ہم مولانا مدنی کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہانت بھی آزادؔ علیہ الرحمۃ کے ہم قدم ہے۔ کسی بھی مسئلے پر لکھتے وقت آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے، مشائخ اور اولیاے کرام کے ملفوظات کو انھی کے الفاظ میں بیان کیا ہے، جہاں کہیں کتابوں کے حوالے آئے ہیں، وہاں ان کی عبارتیں انھی کے الفاظ میں نقل کی ہیں اور بعض اوقات ان کے صفحے تک نوٹ کرتے چلے گئے ہیں، اسی طرح اشعار کے استعمال میں بھی مولانا مدنی علیہ الرحمۃ نہ صرف مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کے شریک ہیں؛ بلکہ یک گونہ ان پر فوقیت بھی رکھتے ہیں، مولانا مدنی علیہ الرحمۃ کے خطوط میں فارسی کے ساتھ اردو کے بہترین اشعار اور غزل کے اشعار بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں اور صرف اسی قدر نہیں؛ بلکہ ہندی کے بھی نرم ونازک اور رسیلے اشعار خاصی تعداد میں ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ مجموعۂ مکتوبات کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں، جو بالکل ذاتی اور نجی نوعیت کے ہیں، ان میں جہاں اس وقت کے سیاسی مسائل پر گفتگو کی گئ ہے اور مولانا نے اپنے سیاسی نظریات کی وضاحت کی ہے، ہوسکتا ہے ہر پڑھنے والا اس سے متفق نہ ہو، کہ یہ ممکن بھی نہیں؛ مگر پھر بھی ان کی اس اہمیت سے مجالِ انکار نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے زمانے کے "شیخ الاسلام" کے افکارِ سیاسی کے بلاواسطہ ترجمان ہیں اور تاریخی دستاویز بھی۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ خطوط کسی بھی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں، جس میں اس کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے، کوئی بھی آدمی کسی کی خوبیوں اور خرابیوں سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو، تو وہ اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی بھی فیصلہ کن پوزیشن تک پہنچ سکتا ہے؛ کیوں کہ یہ وہ تحریر ہے، جو بغیر کسی بناوٹ اور سجاوٹ کے لکھی جاتی ہے؛ کیوں کہ خطوط نہ تو اظہارِ علم کا ذریعہ ہوتے ہیں اور نا ہی اپنی ذات کو بلند آہنگ طریقے سے پیش کرنے کا وسیلہ؛ بلکہ یہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے

سے چھوٹے معاملات کے تئیں خطوط نگار کی بے ساختہ رائے کا اظہار ہوتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ خطوط کے آئینے میں کوئی بھی شخصیت اپنے اصلی خط وخال سمیت منعکس ہوجاتی ہے، اس لحاظ سے بھی اگر ''مکتوباتِ شیخ الاسلام'' کا مطالعہ کیا جائے، تو پڑھنے والا مکتوب نگار کی مقناطیسی شخصیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ بے ساختہ طور پر خود کو ان سے قریب ہوتا ہوا، ان کی جانب کھنچتا ہوا اور ان سے متاثر ہوتا ہوا پائے گا۔

جہاں تک ان خطوط کی زبان کا تعلق ہے، تو وہ عموماً انتہائی سادہ، رواں، سلیس، شگفتہ اور ہر نوع کی پیچیدگی سے مبرّا ہے؛ البتہ جہاں آپ نے کسی خاص علمی و باطنی مسئلے کی وضاحت کی ہے، وہاں قدرے خشکی پائی جاتی ہے، جس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں؛ کیوں کہ وہ مکتوب جس میں خالص علمی، اخلاقی اور باطنی مباحث ہوں، انھیں مکمل طور پر ادبی آہنگ میں نہیں ڈھالا جاسکتا، کہ اس سے مکتوب نگار کے مقصودِ اصلی کے فوت ہوجانے کا دھڑکا پیدا ہوجائے گا اور اصل بات، جو وہ مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتا ہے، الفاظ کی رنگینیوں میں کھوجائے گی، محشر اعظمی نے غالب کے خطوط اور مولانا آزاد کے غبارِ خاطر سے مکتوباتِ شیخ الاسلام کا موازنہ کرتے ہوئے عمدہ تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''مکتوبات کا کون سا اسلوب پسندیدہ ہے اور کون نہیں، یہ تو اپنے اپنے ذوق کی باتیں ہیں، کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی، بے تکلفی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا، کسی نے مولانا آزاد کی غبارِ خاطر اس وجہ سے پڑھی کہ اس میں ایک خاص قسم کی چاشنی ہے، الفاظ کی سجاوٹ ہے، جملوں کی خوب صورت ترکیب ہے اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ معمولات کا دریا موج زن ہے اور مکتوباتِ شیخ الاسلام کو اس وجہ سے پسند کیا جاسکتا ہے کہ اس میں خالص علمی وروحانی باتیں ہیں، ایسے خطوط جن میں صرف زبان وبیان کی خوبی ہو اور ان میں کوئی بنیادی خوبی نہ ہو، ان کے مطالعے سے قاری کو ایک لذت تو مل سکتی ہے؛ لیکن اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، ہمارے اس نقطۂ نظر پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں، پھر خطوط و مکاتیب میں اس کا کیا سوال؟ تو یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے اور ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے؛ لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم دوسروں کے مکتوب کیوں پڑھتے ہیں؟ اور کسی کے مکتوب پڑھتے وقت ہمارے دل میں کیا خیال پیدا ہوتا ہے؟ وقت اور دماغ صرف کرنے کے بعد ہمیں کیا ملتا ہے؟ دوسروں کے مکتوب ہم اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان سے ہمیں

کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو، جو تحریر ہمارا وقت اور دماغ لے کر بھی ہمیں کچھ نہ دے سکے، تو اسے پڑھنے کا کیا حاصل؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خطوط و مکاتیب الفاظ و تراکیب کا حسین مجموعہ تو ہوں، ساتھ ہی ان میں افادیت بھی ہونا چاہیے، مکتوباتِ شیخ الاسلام میں بیش تر مکتوبات ایسے ہیں، جو تعلیم وہدایت کے آئینہ دار ہیں اور کسی نہ کسی کے استبصار پر لکھے گئے ہیں، وہ خطوط، جن میں علمی، اخلاقی، فقہی اور باطنی مباحث ہوں، انھیں اس سے زیادہ رنگ نہیں دیا جاسکتا"۔(۱)

ان مکتوبات سے منتخب کر کے دو دیگر مجموعے بھی مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک "معارف و حقائق" ہے، جسے حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے داماد اور مدرسہ شاہی مرادآباد کے سابق مہتمم مولانا رشید الدین حمیدی علیہ الرحمۃ نے مرتب کیا ہے، اس میں تصوف و سلوک، فقہ، علمی حقائق، عملیات، اذکار وادعیہ، تعبیر الرؤیا، تاریخ، سیاسیات اور دیگر متفرق موضوعات سے متعلق منتخب تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے اور دوسرا "فتاویٰ شیخ الاسلام" ہے اور اس میں خالص فقہی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے، اس کے جامع و مرتب حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کے نواسے اور ممتاز عالم دین وصاحبِ قلم مفتی محمد سلمان منصور پوری مدظلہ العالی ہیں۔

متحدہ قومیت اور اسلام

۸/جنوری ۱۹۳۸/کی شب میں صدر بازار دہلی کے ایک جلسے میں مولانا مدنی علیہ الرحمۃ نے تقریر فرمائی، جس کا بڑا حصہ ۹/جنوری کے روزنامہ "تیج" اور "انصاری" دہلی میں شائع ہوا، اس جلسے میں روزنامہ "الامان" (اس کے مدیر مولانا مظہر الدین شیر کوٹی فاضل دیوبند تھے، جو پکے مسلم لیگی تھے) کا رپورٹر بھی موجود تھا، اس نے اپنے حساب سے اس تقریر کی رپورٹنگ کی اور اس کے بعد اسے "الامان" میں شائع کر دیا گیا، پھر اس سے "زمیندار" اور "انقلاب" لاہور نے بھی نقل کیا اور یہ جملہ مولانا سے منسوب کر دیا کہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں؛ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔ اُدھر علامہ اقبال، جو اپنے وقت کے بے مثال اسلامی شاعر اور مفکر تھے اور وہ بھی ایک عرصے تک قومی نظریے کی حمایت میں لکھتے، بولتے اور اس کی ہم نوائی کرتے رہے تھے، ان کی مشہور نظم "ہمالیہ" اور "ترانۂ ہندی" اسی دور کی یادگار ہیں؛ مگر جب انھوں نے یورپ کا

دورہ کیا اور وہاں کی تہذیب، طریقۂ زندگی، سیاسی نظریات وافکار کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہاں سے واپس ہوئے، تو ان کا سیاسی نقطۂ خیال بدل چکا تھا، انھوں نے واپسی کے بعد قومی راہ نماؤں کو خطوط لکھے، اخبارات میں اپنے مضامین شائع کروائے اور مسلمانوں کو دو قومی نظریے پر ابھارنا شروع کر دیا اور چوں کہ اس وقت مسلم لیگ کا اساسی نظریہ یہی تھا؛ اس لیے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ اسی کی حمایت و موافقت میں جٹ گئے، انھوں نے سب سے پہلے ۱۹۳۰/ کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے شمال مغربی ہندوستان کی علیحدگی کی تجویز پیش کی اور اسے وطن کی معاشرتی مشکلات اور ہندو مسلم منافرتوں کا حل بتلایا، اس کے بعد ان کے افکار کی ساری توانائی اور تخیلات کی تمام تر بلند پروازیاں اسی خیال کو تقویت پہنچانے اور قوم پرست علما اور لیڈران پر پھبتیاں کسنے میں صرف ہوئیں۔ ''الامان'' کے واسطے سے نقل شدہ خبر جب علامہ موصوف کو پہنچی، جو ان کے نظریے کے سخت خلاف تھی، تو انھوں نے مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ پر سخت تنقید کی:

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ　　　زدیوبند حسین احمد ای چہ بوالعجبی ست؟

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست　　　چہ بے خبر زمقامِ محمدِ عربی ست

بہ مصطفی بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی ست

علامہ اقبال کے یہ اشعار روزنامہ ''احسان'' میں شائع ہوئے، اس کے بعد پورے ملک میں ہنگامہ، بے چینی اور خلش کا ماحول پیدا ہو گیا، جہاں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے حامیین مولانا مدنی علیہ الرحمۃ کے خلاف زبان درازی و قلم درازی پر اتر آئے، وہیں خود حضرت کے متوسلین کی طرف سے بھی جوابِ آں غزل کے طور پر تحریروں اور بیانات کا اک سلسلۂ دراز شروع ہو گیا، جو کسی آن تھمنے کا نام نہ لیتا تھا، مولانا کی طرف سے وضاحتی بیان بھی شائع ہوا، جس میں آپ نے اپنی جانب منسوب کیے گئے جملے کی تردید کی تھی، اسی کے بعد اعظم گڑھ کے مشہور شاعر اقبال سہیل نے بھی علامہ اقبال کے خلاف انھی کی بحر میں ایک لمبی اور تیز و تند نظم کہی تھی:

کسے کہ خردہ گرفت بر حسین احمد　　　زبانِ او عجمی وکلام در عربی ست

کہ گفت برسرِ منبر کہ ملت از وطن است — دروغ گوئی وایراد، ایں چہ بوالعجبی ست
درست گفت محدث کہ قوم از وطن ست — کہ مستفاد زفرمودۂ خدا و نبی ست
زبانِ طعن کشودی و ایں نہ دانستی — کہ فرقِ ملت و قوم از لطائفِ ادبی ست
تفاوتے ست فراواں میانِ ملت و قوم — یکے زکیش و دگر کشوری ست یا نسبی ست
خداے گفت بہ قرآں ”لکل قوم ہاد“ — مگر بہ نکتہ کجا پے بَرد کسے کہ غبی ست
بہ قومِ خویش خطابِ پیمبراں بہ نگر — پُر از حکایتِ ”یاقوم“ مصحفِ عربی ست
رموزِ حکمتِ ایماں زفلسفی جستن — تلاشِ لذتِ عرفاں زبادۂ عنبی ست
بہ دیوبند درآ گر نجات می طلبی — کہ دیوِ نفس سلح شور و دانشِ توصبی ست
بہ گیر راہِ حسین احمد گر خدا خواہی — کہ نائب ست نبی را و ہم ز آلِ نبی ست

(ترجمہ از نائب مدیر: کس کی اتنی ہمت ہے کہ وہ حسین احمد کی گرفت کرے حالانکہ اس کی زبان توعجمی ہے اور اعتراض عربی پر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انھوں برسرِ منبر کہا ”ملت وطن سے بنتی ہے“ ۔ جھوٹ اور الزام تراشی، یہ کتنی عجیب حرکت ہے۔ محدث (یعنی حضرت مدنی) نے بالکل درست فرمایا کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ یہ بات خدااور نبی کے اقوال سے ماخوذ ہے۔ تم نے زبانِ طعن درازکی اور اتنی سی بات نہ سمجھے کہ ملت اور قوم میں فرق ادبی باریکیوں میں سے ہے۔ ملت اور قوم میں بہت زیادہ فرق ہے، ملت؛ دین سے جبکہ قوم ملک وخاندان سے وجود میں آتی ہے۔ خدانے قرآن میں فرمایا ”ہر قوم کا ایک رہبر ہے“ مگر وہ جوکند ذہن ہے اس نکتے کی طرف نہ دیکھ سکا۔ نبیوں نے اپنی اپنی قوم کو جس طرح مخاطب کیا اس نے نہ دیکھا، حالانکہ قرآن یاقوم کے الفاظ سے بھرا ہوا ہے۔ ایمان کی حکمتیں ایک فلسفی سے لینا، یہ تو ایسا ہے جیسے معرفتِ الٰہی کی تلاش انگور کی شراب میں۔ اگر نجات چاہتے ہو دیوبند آؤ۔ تمھارا نفس طاقتور ہوگیا ہے اور عقل میں بچپنا ہے۔ اگر خدا کا قرب مطلوب ہے توحسین احمد مدنی کے راستے پر چلو کہ وہ نبی پاک ﷺ کا نائب ہے اور آلِ رسول ﷺ سے بھی ہے)۔

خوش قسمتی سے ایک دردمند اور باشعور وذی فہم مسلمان نے (جو عالمِ دین بھی تھے اور ادیب وصحافی بھی) جنھوں نے

مصلحتاً اپنا نام طالوت (اصل نام عبدالرشید نسیم) رکھ لیا تھا، حقیقت حال دریافت کرنے کے لیے حضرت مدنی کی خدمت میں ایک خط لکھا، جس کا حضرت مدنی نے جواب دیا اور اپنی تقریر کا مدعا بہ وضاحت بیان کیا، پھر انھوں نے ان کے خط کا اقتباس علامہ اقبال کی خدمت میں ارسال کیا، جس کو دیکھنے کے بعد علامہ موصوف نے اپنا تبصرہ واپس لے لیا اور فرمایا کہ: ''میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا... مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں''۔(۲)

علامہ اقبال کا یہ اعتراف نامہ ''احسان'' کے علاوہ ۵/مارچ ۱۹۳۸/کو روز نامہ ''مدینہ'' بجنور میں بھی شائع ہوا تھا، خیر! علامہ اقبال نے تو اپنی بات واپس لے لی؛ مگر ان کا وہ قطعہ ''ارمغانِ حجاز'' کے ترتیب کاروں نے نہ معلوم کن مصلحتوں کے تحت چھاپ دیا اور اب تک یہ سلسلۂ زبوں جاری ہے؛ حالاں کہ علامہ کے بعض دوستوں اور ماہرین اقبالیات کی یہ رائے تھی کہ اگر وہ ان کی زندگی میں چھپتی، تو یہ اشعار اس میں شامل نہ کیے جاتے، خواجہ عبدالوحید لکھتے ہیں: ''ارمغانِ حجاز'' اگر حضرت علامہ کی زندگی میں چھپتی، تو یہ نظم اس میں شامل نہ ہوتی''۔(۳) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بھی ''سرگزشت اقبال'' میں تحریر کیا ہے: ''اگر وہ ''ارمغانِ حجاز'' کی ترتیب اپنی زندگی میں کرتے، تو شاید وہ تین اشعار درج نہ کرتے، جن میں مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ پر چوٹ کی گئی تھی''۔(۴) ماہرِ اقبالیات و شارحِ کلیاتِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں: ''حقیقتِ حال سے واقف ہونے کے بعد علامہ نے اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا اور وہ اشعار محض اس وجہ سے ''ارمغانِ حجاز'' میں راہ پاگئے کہ اس اعتراف کے محض تین ہفتوں کے بعد علامہ وفات پاگئے اور انھیں یہ ہدایت دینے کا موقع نہ مل سکا کہ ان اشعار کو ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل نہ کیا جائے، اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ ''ارمغانِ حجاز'' میں اس نظم کے ساتھ یہ صراحت کردی جائے کہ حقیقتِ حال سے آگاہ ہوجانے کے بعد علامہ مرحوم نے ان اشعار کو کالعدم قرار دے دیا تھا، تو بہت اچھا ہو؛ کیوں کہ اس تصریح کی بہ دولت قارئین حضرتِ اقدس علیہ الرحمۃ کے خلاف سوے ظن سے محفوظ ہوجائیں گے''۔(۵) مولانا حکیم فضل الرحمن سواتی علیہ الرحمۃ نے بھی حافظ شیراز علیہ الرحمۃ اور مسٹر محمد علی جناح کے تعلق سے علامہ موصوف علیہ الرحمۃ کے ایرادات سے رجوع کی تفصیلات تحریر کرتے ہوئے یہی بات لکھی ہے۔(۶)

برسرِ مطلب، حضرت مدنی کا رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" اسی پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے، حضرت نے اس بحث کے خاتمے کے بعد ارادہ کیا کہ اپنے نظریے کو واضح اور مدلل طور پر علامہ موصوف کے سامنے پیش کر دیں؛ تاکہ ان کے دل سے شبہات واشکالات کا کانٹا بھی نکل جائے اور انھیں اپنے ان تسامحات کا بھی ادراک ہو جائے، جو ان سے قوم اور ملت کی تشریح کے دوران سرزد ہوئے، کہ ناگاہ علامہ کے سانحۂ ارتحال کا حادثۂ جاں کاہ رونما ہو گیا اور آپ کے عزم وارادے پر اوس پڑ گیا، آپ نے رسالے کے آغاز میں لکھا ہے: "بالآخر جب کہ میں قومیت کی لفظی بحث کے اختتام پر پہنچ کر مقصدِ اصلی سے نقاب اٹھانا چاہتا تھا، ناگاہ جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے وصال کی خبر شائع ہو گئی، اس ناساز اور دل گداز خبر نے خرمنِ خیالات وعزائم افکار پر صاعقہ کا کام کیا، طبیعت بالکل بجھ گئی اور عزائم فسخ ہو گئے، تحریر شدہ اوراق کو طاقِ نسیاں کے سپرد کر دینا ہی انسب معلوم ہوا"۔(۷)

مگر جن لوگوں نے اس بحث کو دیکھا اور سنا تھا، انھیں اس سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ کی مفصل تحریر سامنے آئے؛ تاکہ صورتِ مسئلہ بے غبار ہو کر اطمینانِ قلب کا باعث ہو؛ اس وجہ سے آپ نے اس تعلق سے اپنی لکھی ہوئی تحریروں کو یک جا کر کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔

یہ کتاب متعلقہ مسئلے پر انتہائی مدلل اور محقق ہے، آپ نے پہلے تو قوم، ملت اور امت پر امہاتِ کتب لغت کی روشنی میں پُر مغز گفتگو کی ہے اور ان کے ادبی لطائف کو آشکار کیا ہے، اس کے بعد نبی پاک ﷺ کے طرزِ عمل سے متحدہ قومیت کے تصور کو ثابت کیا ہے، اس سلسلے میں آپ نے اس معاہدے کو بنیادِ تحریر بنایا ہے، جو آپ نے مدینہ پہنچنے کے بعد وہاں کے قبائل یہود سے کیے تھے، آپ نے اس کی چند دفعات کا ذکر کیا ہے، جن میں صراحت ہے کہ ہر مذہب کا ماننے والا مذہبی امور میں تو اپنے اپنے مذہب کا ہی پابند ہو گا؛ مگر ملکی، سیاسی اور جنگی امور میں سب ایک اور متحد ہوں گے اور ایک دوسرے کے حلیف، اس سلسلے میں آپ نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ پشاور دسمبر ۱۹۲۷/ میں پیش کردہ حضرت علامہ شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ کے خطبۂ صدارت سے بھی استدلال کیا ہے، جس میں انھوں نے بھی میثاقِ مدینہ کو متحدہ قومیت کی اساس قرار دیا تھا، اسی طرح گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۰/ میں کی گئی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر علیہ الرحمۃ کی اس معرکہ

آرا تقریر کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ مذہب کے معاملے میں میں اوّل، دوم اور آخر مسلمان ہوں اور سوائے مسلمان کے کچھ بھی نہیں اور جن امور کا تعلق ہندوستان سے، اس کی آزادی سے اور اس کی فلاح و بہبود سے ہے، تو ان میں میں اوّل ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں اور آخر ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی کے سوا کچھ نہیں، اسی طرح سرسید مرحوم کی مختلف تحریریں بھی استشہاداً پیش کی ہیں، آپ نے انگریز مفکرین کی تحریروں کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ متحدہ قومیت کے نظریے سے اختلاف اور دو قومی نظریے کی بانگ بلند کرنا، یہ انگریزی تدبیر اور چال بازی کا نتیجہ تھا۔ یہ رسالہ گو ایک خاص پسِ منظر میں لکھا گیا تھا؛ مگر آج دو قومی نظریوں اور اسلامیت کی بنیاد پر حاصل کیا گیا خطۂ زمین تمام تر غیر اسلامی اعمال کی آماج گاہ بن چکا ہے اور وہاں بسنے والی اسلامی نسل کا لمحہ لمحہ ہلاکتوں، بربادیوں اور بیش از بیش خطرات کے مایا جال میں گھرا ہوا ہے۔

جاری ہے

حواشی

(۱) روزنامہ الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۱۷۴۔

(۲) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، اقبال اور مولانا سید حسین احمد مدنی، الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۸۳۔

(۳) الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، بہ حوالہ: اقبال ریویو، جنوری ۱۹۶۹/، ص:۶۷۔

(۴) ص:۴۷۵۔

(۵) پروفیسر یوسف سلیم چشتی، اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی، مشمولہ: الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۸۳۔

(۶) ڈاکٹر اقبال کی چند تنقیدات و ترجیعات، مشمولہ: الجمعیۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص:۳۹۰-۳۸۵۔

(۷) ص:۶، مطبوعہ: مجلس قاسم المعارف، دیوبند۔

* * * * *

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۹)

خلافتِ عباسیہ اور سلطنتِ روم

عہدِ ابوالعباس السفاح (۱۳۲ تا ۱۳۶ھ)

ابو العباس عبد اللہ بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس، حضور کریم ﷺ کے چچازاد بھائی اور ترجمان و مفسرِ قرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی للہ عنہما کے پڑپوتے تھے۔ عباسیوں کی تحریک انھی کے دور میں بنوامیہ کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہوئی اور ۱۳۲ھ میں خلافتِ بنوامیہ کا خاتمہ ہوا۔ یہ پہلے عباسی خلیفہ بنے اور ابوالعباس السفاح کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا دور چار سال پر محیط رہا جس میں وہ زیادہ تر داخلی طور پر مخالفین کو کچلنے میں مصروف رہے۔ ۱۳۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

عہدِ ابو جعفر منصور (۱۳۷ تا ۱۵۷)

یہ پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس کے بڑے بھائی تھے اور اس کی وصیت کے نتیجے میں خلیفہ بنائے گئے۔ ان کا نام بھی عبد اللہ ہی تھا۔ یعنی عبد اللہ بن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس، یہ ابو جعفر منصور کے نام سے مشہور ہوئے۔ خلافتِ عباسیہ کو منظم کرنے کا سہرا انھی کے سر ہے۔ ابو جعفر منصور کے دور میں سنہ ۱۳۸ھ میں شاہِ روم قُسطنطین پنجم نے مَلَطیہ کے محاذ پر حملہ کیا اور شہر فتح کر لیا۔ خلیفہ نے اپنے چچا صالح بن علی بن عبد اللہ بن عباس کو مَلَطیہ کے محاذ پر روانہ کیا اور ان کے ساتھ اپنے دوسرے چچا عباس بن علی بن عبد اللہ بن عباس کو مامور کیا۔ ان دونوں نے ۱۳۹ھ میں شہر فتح کیا اور شہر پناہ کی تعمیر کی۔

۱۴۰ھ میں حسن بن قحطبہ اور عبدالوہاب بن ابراہیم الامام بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے روم کے بعض علاقوں پر حملہ کیا۔ دوسری جانب سے شاہِ روم خود مقابلے پر آیا۔ لیکن باقاعدہ لڑائی نہ ہوئی۔ اس کے بعد ابو جعفر منصور کچھ اندرونی بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف رہے جبکہ دوسری طرف سے بھی کوئی حملہ نہ ہوا تو ۱۴۹ھ میں عباس بن محمد نے روم کے بعض علاقوں پر حملہ کیا، حسن بن قحطبہ اور محمد بن اشعث بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ محمد بن اشعث راستے ہی میں انتقال کر گئے۔ ۱۵۳ھ کے موسمِ گرما میں معیوف بن یحیی الحجوری نے بعض رومی علاقوں پر حملہ کر کے کئی قلعے فتح کر لیے۔ انھوں نے قدیم رومی ساحلی شہر اللاذقیہ فتح کیا اور ہزاروں جنگی قیدی ہاتھ آئے۔ ۱۵۵ھ میں شاہِ روم نے خلیفہ ابو جعفر منصور کی خدمت میں صلح کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ ابن الاثیر اور امام طبری نے اس کا ذکر بغیر تفصیل کے کیا۔ ۱۵۸ھ میں ابو جعفر منصور حجِ بیت اللہ کے لیے گئے۔ دورانِ سفر انھوں نے اپنے قریبی لوگوں کو بتایا کہ میری پیدائش ذی الحجہ میں ہوئی تھی اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ذی الحجہ ہی میں میرا انتقال ہوگا اور لگتا ہے کہ یہ اسی حج کے موقعے پر ہوگا۔ چنانچہ ذی الحجہ کی ۶ یا ۷ تاریخ کو مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہوا اور جنت المعلّٰی میں مدفون ہوئے۔ مرنے سے پہلے انھوں نے سرداران سے اپنے ولیٔ عہد محمد بن عبداللہ کی بیعت کی تجدید کرائی۔

عہدِ خلیفہ مہدی (۱۵۹ تا ۱۶۹ھ)

محمد بن عبداللہ، اپنے والد ابو جعفر منصور کے انتقال کے بعد خلیفہ بنے اور المہدی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کے دور میں روم کے ساتھ چپقلش جاری رہی۔ ۱۵۹ھ میں انھوں نے عباس بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کو مامور کیا جنھوں نے رومی علاقوں پر قبضہ کیا اور بہت سارا مالِ غنیمت حاصل کیا۔ ۱۶۱ھ میں ثمامہ بن ولید اپنے لشکر کو لے کر دابق کے مقام پر پہنچے، رومی لشکر سے ان کا ٹکراؤ ہوا لیکن مسلمان آگے نہ بڑھ سکے۔ ۱۶۲ھ میں حسن بن قحطبہ نے روم کے بعض علاقے فتح کیے اور بہت سوں کو قیدی بنایا۔ اسی سال یزید بن ابی اَسِید السُلَمی نے قالیقلا کی طرف سے روم پر حملہ کیا اور رومی فوجوں کو شکست دی اور بہت سا مالِ غنیمت اور جنگی قیدی حاصل کیے۔ (ابنِ کثیر) ۱۶۳ھ میں خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے ہارون الرشید کو روم پر حملے کا حکم دیا۔ خالد بن برمک اور حسن بن قحطبہ بھی لشکر میں شامل تھے۔ جب لشکر بغداد سے روانہ

ہوا تو خلیفہ مہدی لشکر کے ساتھ چلے یہاں تک کہ لشکر روم کی سرحدوں میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے خلیفہ مہدی بیت المقدس کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے جب کہ لشکر روم کی حدود میں پیش قدمی کرتا رہا۔ اس حملے میں مسلمانوں نے مصیصہ اور طرسوس کے نزدیک صمالو (سمالو) کے علاقے کو فتح کیا اور بہت سے جنگی قیدی ہاتھ آئے۔ ۱۶۵ھ میں ہارون الرشید نے ایک لاکھ کے لشکرِ جرّار کے ساتھ روم پر حملہ کیا اور ان کی فوج کو شکستِ فاش دی۔ ہزاروں رومی مقتول ہوئے اور ہزاروں قیدی بنائے گئے۔ جانوروں اور سازوسامان کی صورت میں کثیر مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ مسلمان لشکر پیش قدمی کرتا ہوا خلیجِ قسطنطنیہ تک جا پہنچا۔ ان دنوں روم کی بادشاہی الیون (لیو ثالث) کی بیوی رینی کے ہاتھ تھی جو اپنے بیٹے کی نیابت کر رہی تھی۔ روم کی طرف سے صلح کی درخواست آئی۔ جو ہارون نے قبول کرلی۔ ستر ہزار دینار سالانہ زرِ تاوان پر تین سال کے لیے صلح کا معاہدہ کیا گیا۔ ۱۶۶ھ میں ہارون اپنی فاتح فوج کے ساتھ واپس لوٹے۔ (الکامل فی التاریخ) ۱۶۸ھ میں جبکہ مدتِ معاہدہ کی تکمیل کو چند ماہ باقی تھے، روم نے صلح کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ اس بار یزید بن بدر البطال کو روم کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا جو جزیرہ کے حاکم تھے۔ انھوں نے کئی علاقے تاراج کیے اور کامیاب واپس لوٹے۔ ۱۶۹ھ میں خلیفہ مہدی کا انتقال ہوا۔

عہدِ موسی الہادی (۱۶۹تا۱۷۰ھ)

خلیفہ مہدی کی وصیت اور ولایتِ عہدی کے مطابق موسی محمد ہادی بن مہدی خلیفہ بنے۔ انھوں نے تقریباً ایک سال حکومت کی۔ ان کے دور میں معیوف بن یحی نے روم پر حملہ کیا اور اُشنہ شہر تک پہنچ گئے۔ انھوں نے بہت سا مالِ غنیمت اور جنگی قیدی حاصل کیے۔

عہدِ ہارون الرشید (۱۷۰تا۱۹۳ھ)

موسی الہادی کے انتقال کے بعد ان کے بھائی اور خلیفہ مہدی کے بیٹے ہارون الرشید خلیفہ بنے۔ حج کثرت سے کرتے اور حج پر جاتے تو سینکڑوں اہلِ علم اور فقہا کو ساتھ لے جاتے اور جب حج پر نہ جاتے تو تین سو افراد کو اپنے خرچ پر حج کے

لیے روانہ کرتے۔ روزانہ سو رکعت نفل ادا کرتے۔ انتہائی سخی تھے۔ محدث محمد بن حازم سے رو رو کر احادیثِ رسول ﷺ سنا کرتے۔ علمائے کرام کی عزت کرتے اور خود ان کے ہاتھ دھلایا کرتے۔ ابنِ سماک زاہد سے وعظ سنتے اور قاضی ابو یوسف سے فقہ میں راہنمائی پاتے۔ بدعتی فرقوں اور زنادقہ کا تعاقب کرتے اور بعض اوقات زنادقہ کو قتل کی سزا اپنے ہاتھ سے دیتے۔ (ابنِ کثیر) ان کے دور میں روم کے ساتھ لڑائیاں جاری رہیں اور اکثر یہ گرمیوں کے موسم میں ہوا کرتیں اس لیے انھیں صائفہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ موسمِ سرما میں روم کے علاقے خاصے ٹھنڈے ہوتے تھے۔ ۱۷۱ھ میں سلیمان بن عبد اللہ البکاء کو حملے کے لیے روانہ کیا گیا جبکہ ۱۷۲ھ میں اسحاق بن سلیمان بن علی کو روم پر حملے کے لیے بھیجا گیا۔ ۱۸۲ھ میں ہارون الرشید خود فوج کی کمان کرتے ہوئے حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے صفصاف کا قلعہ فتح کیا۔ اسی سال عبد الملک بن صالح نے حملہ کیا اور انقرہ تک پہنچ گئے۔ اگلے سال یعنی ۱۸۲ھ میں عبد الرحمن بن عبد الملک بن صالح نے حملہ کیا اور اصحابِ کہف کے علاقے (اُفسوس) تک کو فتح کیا۔ اسی سال روم نے اپنی قیادت قسطنطین بن الیون سے لے کر اس کی ماں رینی کو سونپ دی۔ ۱۸۳ھ میں خزری قبائل نے آرمینیا پر چڑھائی کی اور بڑی تعداد میں مسلمانوں کو قیدی بنا لیا۔ ہارون نے خزیمہ بن خازم اور یزید بن مزید کو ادھر روانہ کیا جنھوں نے قومِ خزر کو پسپا کیا۔ ۱۸۶ھ میں امیر المؤمنین، ہارون الرشید اپنے دو بیٹوں، عبد اللہ بن ہارون المامون، محمد بن ہارون الامین اور علما و فقہا کی ایک جماعت کے ساتھ حج پر تشریف لے گئے۔ جبکہ چھوٹے بیٹے قاسم بن ہارون المؤتمن اپنی عملداری کے علاقے میں تھے۔ بیت اللہ شریف میں انھوں نے ولی عہدی کا ایک طویل پروانہ لکھوایا جس میں ولی عہدی کے ساتھ، اتفاق کی تاکید اور ناچاقیوں کا سدِّباب کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ ارکانِ سلطنت، صاحبزادگان اور جماعتِ فقہا و علما کو گواہ بنا کر اس معاہدے پر دستخط کیے گئے۔ بعد میں یہ معاہدہ علما کے حوالے کیا گیا کہ وہ حاجیوں کے مجمعِ عام میں اس کو پڑھ کر سنا دیں۔ اس تحریر کے مطابق امیر المؤمنین نے اپنے درمیانے بیٹے محمد بن ہارون المعروف الامین (ابنِ زبیدہ) کو اپنا ولیٔ عہد قرار دیا اور الامین کے بعد بڑے بیٹے عبد اللہ بن ہارون المعروف المامون (ابنِ امِّ ولد، مراجل) کو ولیٔ عہد مقرر کیا جبکہ المامون کا ولیٔ عہد چھوٹے بیٹے قاسم بن ہارون المعروف المؤتمن (ابنِ امِّ ولد) کو مقرر کیا گیا تھا۔ (تاریخِ شاکر، تاریخِ طبری) ۱۸۷ھ میں روم نے رینی اغسطہ کو معزول کیا اور اس کی جگہ نقفور بادشاہ

بنا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شخص جبلہ بن ایہم الغسانی کی اولاد میں سے تھا۔ جو مرتد ہو کر روم فرار ہو گیا تھا۔ نقفور نے مسلمانوں سے کیا گیا معاہدہ بھی توڑ دیا جو ملکہ رینی کے دور میں ہوا تھا۔ نقفور نے ہارون کو خط لکھا کہ ہماری ملکہ نے خواتین کی روایتی بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تم سے صلح کی اور تمھاری پیش قدمی کو تسلیم کیا اور کثیر مال تمھارے حوالے کیا جس کے تم حقدار نہ تھے۔ میرا خط ملتے ہی تم وہ مال مجھے واپس ارسال کرو بلکہ اپنی طرف سے کچھ فدیہ بھی روانہ کرو ورنہ تلوار ہمارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ ہارون نے مختصراً لکھا کہ میرا جواب عنقریب تمھیں مل جائے گا۔ اس کے بعد خلیفہ نے اپنے صاحبزادے قاسم بن ہارون رشید المعروف المؤتمن کو روم پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رومی فوج قلعہ بند ہو گئی اور مسلمانوں نے قرّہ قلعے کا محاصرہ کر لیا جبکہ عباس بن محمد بن اشعث نے سنان قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ جب رومی مشکلات کا شکار ہوئے تو انھوں نے صلح کی درخوست کی جو اس شرط پر منظور ہوئی کہ تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ اس کے بعد ہارون خود فوج کی قیادت کرتے ہوئے روم کی جانب روانہ ہوئے اور باب ہرقلہ کی جانب سے کئی سرحدی علاقے فتح کر لیے اور بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا اور یہاں سے نقفور شاہِ روم کو خط لکھا کہ تاوانِ صلح کی جو رقم تم سالانہ بھیجتے ہو وہ ارسال کرو۔ شاہِ روم نے اس مطالبے کو پورا کرتے ہوئے صلح کی تجدید کر لی تب مسلمان حملہ آور واپس ہوئے۔ ہارون ابھی رقہ کے مقام تک ہی پہنچے تھے کہ معلوم ہوا کہ نقفور نے صلح توڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ (معارک بین العربِ والروم ۲۰،۲۱) ۱۸۸ھ میں مسلمانوں نے صفصاف کے علاقے کی طرف سے پھر حملہ کیا۔ یہاں شاہِ روم خود مقابلے پر آیا لیکن زخمی ہو کر پسپا ہوا۔ اس جنگ میں ہزاروں رومی مارے گئے۔ (الکامل) ۱۸۹ھ میں قاسم بن ہارون الرشید مرج دابق میں مقیم رہے۔ اس سال خلیفہ نے مسلمان قیدیوں کا فدیہ روانہ کر کے قیدی آزاد کروائے یہاں تک کہ کوئی مسلمان قید میں نہیں رہ گیا۔ ۱۹۰ھ میں خلیفہ ہارون پھر روم کی طرف روانہ ہوئے اور تیس روزہ محاصرے کے بعد ہرقلہ کو فتح کر لیا۔ اس کے علاوہ داؤد بن عیسیٰ بن موسیٰ نے بھی کئی رومی علاقے فتح کیے۔ خلیفہ نے آگے بڑھ کر طوانہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ شاہِ روم نقفور نے صلح کی درخواست کی۔ مسلمان فوجوں کی واپسی کے لیے تاوان ادا کیا اور اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فدیہ ادا کیا۔ (تاریخِ شاکر، ۵،۱۵۷)

۱۹۱ھ میں اہلِ قبرص نے صلح کے معاہدے سے انحراف کیا۔ سزا کے طور پر معیوف بن یحیٰ نے قبرص پر حملہ کیا اور سترہ

ہزار غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔۱۹۱ھ ہی میں یزید بن مخلد الھبیری نے دس ہزار کی فوج کے ساتھ روم پر حملہ کیا۔لیکن وہ رومیوں کے گھیرے میں آگئے۔پچاس جانوں کی قربانی دے کر مسلمان نکلنے میں کامیاب ہوئے البتہ کمانداریزید اس جنگ میں شہید ہوگئے۔اس کے بعد روم نے مرعش کی طرف سے مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ کیالیکن مار کھاکر پیچھے بھاگے۔۱۹۲ھ میں ہارون الرشید نے ثابت بن نصر بن مالک کو سرحدوں کی نگہداشت پر مامور کیا۔وہ رومی سرحدوں میں داخل ہوئے اور مطمورہ کا شہر فتح کیا۔اس کے بعد مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان صلح ہوگئی۔(ابنِ کثیر و تاریخِ شاکر، ۵، ۱۵۷، ۱۶۰)اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہارون نے ایک خواب دیکھا جس سے انھوں نے اپنی موت کے قریب ہونے کا اندازہ کرلیا۔جب وہ خراسان کے سفر پر روانہ ہوئے تو طوس سے گزرتے ہوئے بیمار پڑ گئے۔چنانچہ انھوں نے طوس میں قیام کیا۔جس گھر میں وہ مقیم تھے وہاں انھوں نے اپنی قبر کھدوائی اور اس قبر پر تلاوت قرآن کا ایک ختم کرایا۔اس دوران وہ قبر کے کنارے بیٹھے موت کی سختیوں کو یاد کرتے رہے۔اسی گھر میں ان کا انتقال ہوااور اپنی بنوائی ہوئی قبر میں مدفون ہوئے۔(ابنِ کثیر)

عہدِ خلیفہ الامین(۱۹۳تا۱۹۸ھ)

ہارون رشید کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے درمیانے بیٹے محمد بن ہارون الامین خلیفہ بنائے گئے۔عبد اللہ بن ہارون المامون اور قاسم بن ہارون المؤتمن اپنی ولایت کے علاقوں پر موجود تھے۔انھوں نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق محمد الامین کو تہنیت اور اطاعت گزاری کا پیغام بھیجا۔لیکن بدقسمتی سے نئے خلیفہ اس معاہدے پر کاربند نہ رہ سکے جو انھوں نے اپنے باپ کے سامنے حرمِ مکی میں کیا تھا۔قاسم بن ہارون المؤتمن اپنے والد کے دور سے الجزیرہ اور رومی محاذات پر والی تھے اور روم کے ساتھ کئی جنگوں میں بھی حصہ لے چکے تھے۔۱۹۴ھ میں امین نے پہلے قاسم کو معزول کیا۔پھر کچھ عرصے بعد اپنے بیٹے موسیٰ کی ولی عہدی کا اعلان کردیا۔اس پر عبد اللہ بن ہارون المامون نے بغداد سے رابطہ منقطع کردیا۔اس کے جواب میں محمد الامین نے عبد اللہ بن ہارون المامون پر فوج کشی کی اور خراسان کی طرف بھی ایک لشکر روانہ کیا۔اس جنگ میں الامین کی فوجوں کو شکست ہوئی۔اس کے بعد چند سال باہمی جنگ و جدل جاری رہا۔اس دوران مختلف علاقوں کے امرا عبد اللہ بن ہارون المامون سے بیعتِ خلافت بھی کرتے رہے۔یہاں تک کہ محمد الامین کی

حکومت بغداد تک محدود ہوگئی اور ۱۹۷ھ کے حج کا خطبہ بھی المامون کے نام کا پڑھا گیا۔ ۱۹۸ھ میں عبداللہ بن مامون کی فوجیں اس کے کماندار طاہر بن حسین کی قیادت میں بغداد پر قابض ہوگئیں۔ محمد الامین ایک مکان میں روپوش پائے گئے جنھیں فوجیوں نے قتل کر دیا۔ اس طرح محمد الامین کا دور ختم ہوا۔ اس عرصے میں روم کے ساتھ کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو مسلمانوں کا باہمی انتشار تھا۔ دوسری طرف سلطنتِ روم بھی اسی قسم کے حالات سے گزر رہی تھی۔ ۱۹۳ھ میں قیصر نقفور ایک بغاوت کو کچلتے ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک روم کو استحکام نصیب نہیں ہوا۔

عبداللہ بن ہارون المامون (۱۹۸ تا ۲۱۸ھ)

المامون، صاحبِ علم شخص تھے۔ علمِ فقہ، علمِ فرائض کے علاوہ علمِ حدیث میں مہارت رکھتے تھے۔ بعض دفعہ اپنی یاداشت سے درجنوں احادیث سند کے ساتھ بیان کرتے تھے اور اپنے خطبوں میں احادیث سند کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قرآنِ پاک کے حافظ تھے اور رمضان میں تلاوتِ قرآن کے ۳۳ دور مکمل کرتے تھے۔ یہ تشیع کی طرف مائل تھے۔ علمائے کرام کے نزدیک یہ تفضیلِ علی رضی اللہ عنہ کے قائل تھے لیکن دیگر اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ مامون اہلِ تشیع کے آٹھویں امام علی الرضا بن موسی الکاظم بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب سے ملے اور انھیں اپنا ولیٔ عہد مقرر کر دیا۔ اس پر عباسی خاندان میں ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ اہلِ بغداد نے مامون کے چچا اور ہارون الرشید کے بھائی ابراہیم بن مہدی سے بیعتِ خلافت کر لی۔ علی الرضا بن موسی کے انتقال کے بعد ابراہیم بھی شکست کھا گئے اور مامون کی خلافت مستحکم ہوگئی۔ مامون نے بغداد میں بیت الحکمت کے نام سے ادارہ قائم کیا جو یونانی علوم عربی میں منتقل کرنے کا کام کرتا تھا لیکن بشر مریسی کے زیرِ اثر خلیفہ خود اعتزالی فکر سے متاثر ہو گئے اور خلقِ قرآن کے عقیدے کے پرچارک بن گئے۔ ان کا ابتدائی دور، روم کے ساتھ جنگوں سے خالی ہے۔ سوائے یہ کہ افریقہ کے امیر زیادۃ اللہ الاغلب نے ۲۰۱ اور ۲۰۲ھ میں بحرِ روم کے بعض رومی جزائر پر حملہ کرکے فتح اور کثیر مالِ غنیمت حاصل کیا۔ مامون کے دور میں رومی جنگوں کا سلسلہ اس دور کے آخری سالوں سے شروع ہوتا ہے۔ ۲۱۵ھ میں المامون خود ایک فوج لے کر روم کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ دابق، انطاکیہ، مصیصہ اور طرسوس سے ہوتے ہوئے انقرہ

تک پہنچے۔ پہلے تو آپ نے شہر کے آدھے حصے پر بزورِ قوت قبضہ کیا اس کے بعد اہلِ شہر نے صلح کرتے ہوئے باقی شہر بھی مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے خلیفہ واپس ہوئے اور دمشق چلے گئے۔ یہاں انھیں اطلاع ملی کہ طرسوس پر شاہِ روم تَوفیل بن میخائل نے حملہ کر کے بہت سارے مسلمانوں کو شہید کر دیا ہے۔ اس پر المامون نے اپنے بھائی، ابو اسحاق بن رشید کو ساتھ لے کر دوبارہ روم پر حملہ کیا اور تیس قلعے فتح کیے۔ دوسری طرف مامون کے وزیر یحی بن اکثم نے طوانہ پر حملہ کیا اور رومیوں کو سخت سزا دی۔ بہت ساروں کو قتل کیا اور بڑی تعداد غلام بنائی گئی۔ (تاریخ شاکر، ج:۵، ص:۲۳)

۲۱۷ھ میں المامون نے روم پر حملہ کیا اور لُؤْلُؤَہ شہر کا محاصرہ کیا جو بے نتیجہ رہا۔ ۲۱۸ھ میں مامون نے اپنے بیٹے عباس بن مامون کو طوانہ شہر کی طرف روانہ کیا جنھوں نے شہر کی منہدم دیواروں کی تعمیر کروائی۔ اسی دوران مامون نے بغداد میں اپنے نائب کو خط لکھا کہ علمائے کرام اور محدثین کو جمع کر کے، قرآنِ مجید کے مخلوق ہونے کے بارے میں ان کی رائے لی جائے اور جو قرآن کو مخلوق نہ کہے اسے سزا دے کر میرے پاس بھیج دیا جائے۔ کئی علمائے کرام نے اس نظریے کا انکار کیا۔ جس پر انھیں مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں اور پھر انھیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے رومی محاذوں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ان میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی تھے۔ آپ نے اللہ کی جناب میں دعا فرمائی تھی کہ خلیفہ مامون کا ان سے آمنا سامنا نہ ہو۔ اسی دوران مامون ایک لشکر لے کر خود روم کی طرف روانہ ہوئے اور اعلان کیا کہ اس بار ہم قسطنطنیہ تک پہنچے بغیر واپس نہ آئیں گے۔ جب وہ لُؤْلُؤَہ کے نزدیک پہنچے تو شاہِ روم نے صلح کی درخواست کی لیکن مامون نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور آگے بڑھتے رہے۔ جب طرسوس کے نزدیک پہنچے تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی دعا قبول ہوئی اور مامون وفات پا گئے۔ (ابنِ کثیر)

جاری ہے

* * * *

مولانا حماد احمد ترک
نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۲)

مسجد کے وسیع صحن میں ہر طرف لوگ نظر آ رہے تھے۔ کہیں بیٹھے ہوئے، کہیں چلتے پھرتے ہوئے اور کہیں کھاتے پیتے ہوئے۔ بچوں کی بھی کثیر تعداد تھی۔ وجہِ تعجب اگرچہ واضح ہے لیکن پھر بھی عرض کیے دیتے ہیں: وہ ترکی جہاں کبھی اذان پر پابندی تھی، حجاب ممنوع، داڑھی رکھنا جرم اور عربی رسم غیر قانونی تھا۔ آج وہاں نمازوں میں اتنی رغبت باعثِ حیرت و خوشی کیوں نہ ہوتی۔ اکثریت مقامی خواتین و حضرات کی تھی۔ یہ وہ استنبول ہے جہاں دنیا کے ہر کونے سے سیاح آتے ہیں اور عیش کوشی کا ہر سامان یہاں میسر ہے۔ اس کے باوجود کسی مسجد میں اتنا ہجوم بلاشبہ قابلِ رشک ہے اور دین دوستی کا ثبوت ہے۔ قارئین کو مسجد لے جانے سے قبل ہم ایک اہم پہلو کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں: وہ یہ کہ سلطان محمد فاتح مسجد میں غیر مقامی سیاحوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ستم یہ ہے کہ دور دراز اسلامی ممالک سے سیاح استنبول آتے ہیں لیکن نہ سلطان کی مسجد کی زیارت کرتے ہیں نہ سلطان کی مرقد پر حاضر ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری فاتح بلدیہ میں سیاحوں کی آمد معدوم ہے۔ انھیں سیاحتی ادارے اس طرف کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے اور نہ ہی لوگ اس طرف آتے ہیں۔ جبکہ سلطان محمد فاتح کی عظمت کے لیے اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ حدیث پاک میں جس امیر کو نعم الأمیر (بہترین سالار) کہا گیا اس کا اطلاق سلطان پر ہوتا ہے۔ بہر حال؛ جس وقت ہم احاطے میں داخل ہوئے تو نمازِ عشا کا وقت قریب تھا۔ اذان شروع ہو چکی تھی۔ یہاں اذان اور نماز میں زیادہ وقفہ نہیں ہوتا، لہٰذا مسجد کے داخلی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ نمازِ عشا با جماعت ادا کی۔ نماز کے بعد معمول کے موافق امامِ مسجد نے تلاوت کی۔ جب دعا ہو چکی تو استادِ محترم نے فرمایا کہ فتحِ استنبول کے شکرانے اور

سلطان کے ایصالِ ثواب کے لیے سورۃ الفتح کی تلاوت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ پھر مسجد سے باہر نکل آئے۔

مسجد میں داخل ہونے کے لیے پہلے ایک چھوٹے دروازے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس پر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۰۳ ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا﴾ (بیشک نماز مسلمانوں کے ذمے ایک ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے) درج ہے۔ داخل ہوتے ہیں تو سامنے وضوخانہ ہے۔ عموماً تمام مساجد میں وضوخانے کا انداز یکساں ہے۔ صحن کے وسط میں دائرے کی شکل میں تعمیر شدہ ان وضوخانوں (جنھیں ترکی میں شادریوان کہا جاتا ہے) پر چھتری نما چھت ہوتی ہے۔ نلکوں کا انداز نہایت شاہانہ ہے۔ نلکہ کھولتے ہوئے بھی فخر محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ نلکا نہیں کوئی شاہی قفل ہاتھوں میں ہے۔ عثمانیوں کے یہاں مساجد کی خوبصورتی اور تزئین و آرائش کا نہایت اہتمام ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، ہر تہذیب اپنی نمائندہ عمارات کی تزئین کا اہتمام کرتی ہے۔ جس طرح یورپ میں بازاروں کی آرائش و زیبائش کا خوب اہتمام نظر آئے گا کہ ان کو وہاں مرکزی اہمیت حاصل ہے اسی طرح مسلمانوں میں مساجد کی زیب و زینت کا اہتمام نظر آئے گا کہ یہ شعائرِ اسلام کی عظمت کا ذریعہ ہے۔

مسجد کے داخلی دروازے پر دوسطری کتبے پر عربی رسم میں سلطان کا نام درج ہے۔ اس سے ذرا نیچے مسجد کے آداب کی رعایت اور زائرین کے وقت کو باعثِ اجر بنانے کے لیے نویت الاعتکاف (میں نیت کرتا ہوں اعتکاف کی) لکھا ہوا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی نظر اوپر کو اٹھتی ہے تو چھت سے معلق خوبصورت فانوس نظر آتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھیں تو مسجد کے درمیانے گنبد پر نظر ٹھہر جاتی ہے جہاں جلی انداز میں خلفاے اربعہ کا نامِ نامی درج ہے جبکہ باقی جگہ دیگر عشرۂ مبشرہ کے اسماے گرامی لکھے ہوئے ہیں۔ داخلی دروازے کی اوپر والی دیوار پر حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے اسماے مبارک تحریر ہیں۔

مسجد سے باہر نکل کر بائیں طرف بڑھیں تو متعدّد اولیا اور علما کی قبور ہیں جن کے گرد آہنی جنگلا لگا ہوا ہے۔ اسی جنگلے کے ساتھ بائیں طرف چلتے ہوئے تھوڑا سا آگے بڑھے تو سلطان محمد فاتح کا مزار نظر آیا۔ اس وقت مزار بند تھا چنانچہ باہر ہی سے فاتحہ خوانی کی۔ سلطان کی مسجد اور مرقد دونوں ہی انوار و تجلیات کا مظہر ہیں۔ یہاں آنکھیں کم اور دل زیادہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ جو کچھ قلم بند ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ قلب پر نقش رہتا ہے "لب پر نہیں آسکتا"۔ سلطان محمد فاتح جنھیں محمدِ

ثانی کہا جاتا ہے (محمدِ ثانی اس لیے کہ ان سے قبل بھی ایک عثمانی سلطان گزرے ہیں جنھیں محمد اول کہا جاتا تھا) نے کم سنی میں سلطنتِ عثمانیہ کی باگ ڈور سنبھالی۔ محض ۲۱ سال کی عمر میں بازنطینوں کے آخری قلعے کو چھین کر عظیم قسطنطنیہ کی فتح اپنے نام کی۔ مسندِ احمد کی روایت ہے: آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے بشارت دی تھی: ''لازماً قسطنطنیہ فتح ہو گا اور کیا ہی بہترین امیر ہو گا وہ امیر (جو اسے فتح کرے گا) اور کیا ہی بہترین ہو گا وہ لشکر''، اس بشارتِ نبوی کا سہرا سلطان کے سر بندھا۔ اس فتح کا قصہ بھی کیا خوب ہے۔ جتنا بیان کرتے ہیں اتنا ہی لطف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اول اول تو سامع کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ایسا کیونکر ممکن ہوا۔

بہترین حفاظتی حصار، مضبوط فصیل اور گہرے پانیوں سے محفوظ اس بازنطینی قلعے کو سلطان نے اللہ کی مدد اور بہترین منصوبہ بندی سے فتح کیا۔ دفاعی لحاظ سے اس شہر میں داخلے کی واحد صورت بحری راستہ تھا جس پر ایک مضبوط زنجیر لگائی گئی تھی اور زنجیر کے اردگرد سپاہیوں کی بڑی تعداد شہر پناہ کی چوکیوں پر مامور تھی۔ سلطان نے راتوں رات سمندر کے ایک حصے سے بحری جہازوں کو زنجیر کے اس پار منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے تحت بحری جہازوں کو خشکی کے ایک حصے سے گزرنا تھا۔ اس کے لیے لکڑی کے تختے بچھائے گئے، اس پر جانوروں کی چربی ملی گئی اور بحری جہازوں کو مضبوط رسیوں کے ساتھ گھوڑوں سے باندھا گیا اور خشکی سے گزار کر زنجیر کے اس پار اتارا گیا۔ یہ کام اس قدر غیر متوقع تھا کہ بازنطینی اس اچانک حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے شکست کھا گئے اور تین محاذوں پر جنگ کرتے ہوئے اسلامی لشکر نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا۔

سلطان کی مرقد سے واپس اولیا کی قبور والے احاطے میں آئے تو استادِ محترم نے بتایا کہ انھیں قبور میں سے ایک قبر عظیم ولی اللہ اور جید عالمِ دین شیخ امین سراج رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ شیخ نے جامعہ ازہر میں کئی سال علومِ دینیہ کی تحصیل کی۔ ترکی لوٹے تو علامہ زاہد الکوثری علیہ الرحمۃ سے استفادہ کیا۔ علامہ زاہد الکوثری سلطنتِ عثمانیہ میں وزیرِ معارف تھے۔ آپ کی ذات علومِ دینیہ کا وہ بحرِ کراں تھی جس نے حنفیہ کے مستدلات اور گراں قدر فقہی ذخیرے کو از سرِ نو زندہ کیا اور وکیلِ احناف کہلائے۔ شیخ امین سراج روے ارضی پر آپ کے آخری شاگرد تھے۔ شیخ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کے

عظیم علمی ذخیرے کو عثمانی دور سے لے کر لادینیت سے واپسی کی طرف مائل ترکی تک منتقل کرنے میں ایک پل کا کردار ادا کیا۔ سیکیولر ترکی کے تمام دورانیے میں شیخ اس روایت کو مسلمانوں میں منتقل کرتے رہے حتی کہ ترکوں میں پھر سے اسلامی شعور اور روایات کی طرف رجوع کا رجحان پیدا ہوا اور اب متعدّد علما خم ٹھونک کر اس میدان میں اتر آئے ہیں۔ صد شکر کہ ہمیں بھی حضرت شیخ امین سراج رحمہ اللہ سے نسبت حاصل ہے، اور وہ اس طرح کہ ہمارے اساتذہ میں سے استاذ العلماء حضرت مولانا مفتی ابو لبابہ شاہ منصور صاحب دامت برکاتہ اور اور استاذِ گرامی حضرت قبلہ مفتی اویس پاشا قرنی صاحب مد ظلہ دونوں کو شیخ امین سراج رحمہ اللہ سے اجازتِ حدیث حاصل ہے اور دونوں ہی اساتذہ نے ہمیں شیخ کی مرویات کی اجازت مرحمت فرمائی۔ الحمد للہ رب العلمین!

شیخ کی علمی خدمات کا تذکرہ کچھ یوں ہے کہ آپ نے سلطان فاتح مسجد کو تعلیم و تعلم کا مرکز بنایا اور علومِ شرعیہ کی نہریں جاری کیں۔ ہزاروں علما و طلبہ آپ سے مستفید ہوئے۔ کئی قیمتی کتب کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ قرآن اور حدیث کو ترکوں میں پھر سے زندہ کیا۔ قضیۂ فلسطین کے لیے ماحول ساز گار بنایا اور ترکی کے مسلمانوں کو القدس کی اہمیت و فضیلت سے رُوشناس کرایا۔ آپ نے مصطفٰی کمال کے جدید جمہوریہ ترکی کو اسلامی روایت اور اقدار سے قریب کیا اور تیزی سے لادینیت کی طرف رواں دواں ترکی کی رفتار کو سست کر دیا۔ شیخ امین سراج اور ان ایسے دیگر علمائے کرام کی خدمات نے سیکیولر ترکی کا منصوبہ ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ گزشتہ برس یعنی ۲۰۲۱ء میں شیخ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اندھیرے میں شیخ کی قبر تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا۔ قبر کی شناخت کے بعد فاتحہ پڑھی اور وہاں سے مسجد کے دوسرے حصے کی طرف بڑھے۔ یہاں کئی کمرے اور عمارتیں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اپنے زمانے میں درس گاہیں اور طلبہ کے رہائشی کمرے تھے۔ سلطان فاتح مسجد کے باہر ایک کتبہ نصب ہے جس میں اس پورے منصوبے کو فاتح سوشل کمپلیکس کہا گیا ہے، اس کتبے پر یہ تحریر لکھی ہوئی ہے: ”یہ کمپلیکس محمدِ ثانی کا تیار کردہ ہے۔ اسے ۱۴۶۳ء سے ۱۴۷۰ء کے درمیان ماہرِ تعمیرات عتیق سنان نے تعمیر کیا۔ ترکی کے اسلامی تعمیراتی ورثے کا یہ سب سے بڑا کمپلیکس ہے جس میں طلبہ کے لیے درس گاہیں، ایک کتب خانہ، ایک ہسپتال، محتاجوں اور فقیروں کی امداد اور داد رسی کے لیے ایک غریب خانہ، مسافر خانہ،

چند دکانیں، سلطان کا مزار اور غسل خانے شامل ہیں۔ اصل مسجد تو کسی زمانے میں منہدم ہوگئی تھی۔ آج جو مسجد موجود ہے اسے سلطان مصطفٰی ثالث نے ۱۷۶۷ء میں ماہرِ تعمیرات محمد طاہر آغا سے تعمیر کروایا۔ موجودہ تعمیر سابقہ تعمیر سے یکسر مختلف ہے۔ اس کے مرکزی گنبد کا قطر ۲۶ میٹر ہے جو چار ستونوں پر کھڑا ہے۔ چار نصف گنبدوں، دو میناروں اور دو بالکونیوں کے ساتھ فنِ تعمیر کا شاہ کار ہے۔ گنبدوں پر انتہائی عمدہ اور نفیس آرائش و زیبائش نظر آتی ہے۔ آرائشی کام میں یورپی طرزِ تعمیر کا عکس بھی جھلکتا ہے۔ مسجد کے دونوں طرف درس گاہیں قائم ہیں، کچھ درس گاہیں سڑک کی تعمیر میں منہدم ہوگئیں اور تقریبًا ۸ درس گاہیں اب بھی موجود ہیں۔ قبلہ کی سَمت میں ایک کتب خانہ موجود ہے جو ۱۷۴۲ء میں قائم ہوا، اس کے دو دروازے اور ایک گنبد ہے''۔

مسجد سے باہر آئے تو ہم نے خود کو ایک بازار میں پایا جو ''مالٹا بازار'' کے نام سے موسوم ہے۔ کچھ دیر بازار میں گھومنے کے بعد عشائیے کے لیے ایک شامی ریستوران میں داخل ہوئے۔ اندر بے پناہ رش تھا۔ پھر بھی ایک کونے میں جگہ مل گئی۔ شامیوں کا خاصہ شاورما ہے لہٰذا اسی کی فرمائش کی گئی۔ کھانے کی تیاری میں تقریبًا آدھا گھنٹہ لگ سکتا تھا۔ ایک دوست نے اسی دوران دلائل الخیرات شریف کی منزل پڑھنی شروع کردی۔ ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ ادھر منزل ختم ہوئی اور ادھر کھانا آگیا۔ شاورمے تو پہلے بھی بہت کھائے تھے لیکن پہلی بار حقیقی شاورما نصیب ہوا۔ بس یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے شاورموں اور اس 'اصلی شامی شاورمے' میں وہی فرق تھا جو کراچی اور پنجاب کی بریانی میں ہوتا ہے۔ اتنی مماثلت تھی کہ دونوں ہم نام تھے۔ باقی، اجزائے ترکیبی، بناوٹ، ذائقے اور تاثیر میں ایسی مخالفت تھی جیسی بھیڑ اور بھیڑیے میں۔ کھانا کھا کر باہر آئے تو ایک دکان سے 'کُنافہ' لیا۔ کُنافہ ایک عرب روایتی میٹھی سوغات ہے اور عربوں کا ہی خاصّہ ہے۔ کُنافہ کھانے کے بعد بازار میں چہل قدمی کی۔ کھجور اور زیتون انواع و اقسام کے سجے ہوئے تھے۔ اور بھی کئی مقامی سوغاتیں نظر آرہی تھیں۔ اسی بازار میں دائرے کی شکل میں بنی ہوئی قدیم عثمانی طرز کی پانی کی سبیل نظر آئی جس کی ہر جانب غالبًا ترکی زبان میں اشعار لکھے ہوئے تھے۔ خطاطی عربی رسم میں تھی اس لیے الفاظ پڑھے جاسکتے تھے۔ البتہ قابلِ فہم صرف محمود خان کا نام تھا۔

بازار سے واپسی کا سفر کچھ طویل ہے، چنانچہ آپ کو ایک دلچسپ نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ راستہ بھی کٹتا رہے

اور وقت بھی کارآمد ہوجائے۔ نکتہ یہ ہے کہ مساجد کو حدیث شریف میں پسندیدہ ترین اور بازاروں کو مبغوض ترین مقامات قرار دیا گیا ہے۔ جب یوں ہے تو پھر سلطان فاتح مسجد کا دروازہ بازار میں کیوں کھلتا ہے؟ صرف اسی مسجد کا نہیں، مسجد ایوب سلطان، بادشاہی مسجد، دلّی کی جامع مسجد وغیرہ وغیرہ۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ مسجد سے متّصل دکانوں کی آمدنی مسجد کے لیے وقف ہوتی تھی، لہٰذا مسجد کے اخراجات کے لیے کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ مسجدیں صرف عبادت گاہ نہیں علمِ دین کی تحصیل کا مرکز بھی ہوا کرتی تھیں، اور مسلمان بالخصوص مساجد میں مقیم علما و طلبہ ضروریاتِ زندگی کے لیے دور دراز نہ گھومتے پھریں، مسجد سے نکلیں اور ضرورت کے موافق خریداری کر کے واپس آجائیں، دنیا کی دیگر رنگینیوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔

یہاں سے رہائش گاہ کی طرف سفر شروع کیا تو ایک مقام پر سحلب نامی مشروب نظر آیا۔ ایک صاحب کے حلق میں کچھ تکلیف تھی، انھیں یہ اجنبی مشروب اپنے حلق کے لیے مفید معلوم ہوا (نہ جانے قبل از استفادہ، افادیت کے کیونکر قائل ہوئے) بہر حال ایک پیالہ انھوں نے حاصل کر لیا۔ یہ قہوے سے مماثل ایک میٹھا مشروب تھا جو گرم مسالوں اور دیگر اجزا پر مشتمل تھا۔ ذائقہ نہایت عمدہ تھا۔ ذائقے کی شہرت نے سب کو اس کا مشتاق کر دیا۔ پیالہ ایک تھا اور امیدوار متعدّد۔ باری باری ہم سب نے اس کا لطف لیا۔ گرم اس قدر تھا کہ یک بارگی بڑا گھونٹ لینا ممکن نہ تھا، پھر بھی اس مختصر سے گھونٹ کے لطف کا دورانیہ اتنا طویل تھا کہ دوسرا دور چلنے تک وہ ذہن کو مشغول رکھتا تھا۔ ان ہلکی پھلکی چسکیوں کی بدولت سحلب کے دور چلتے رہے اور فاصلہ کم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کارا گمرک اپنی رہائش پر آن پہنچے۔ سب ہی تھکے ہوئے لگ رہے تھے لہٰذا اپنے اپنے بستروں پر دراز ہوگئے۔

نمازِ فجر میں اٹھانا ایک ساتھی نے اپنے ذمے لے لیا۔ مستقل چلنے کی وجہ سے نیند بھی خوب آئی۔ رات جتنی گہری ہوتی جاتی تھی موسم بھی مزید سرد ہوتا جاتا تھا۔ خیر، نمازِ فجر کے قریب ہڑبڑاہٹ سے نیند ٹوٹ گئی اور آنکھ کھلی تو باہر شور سا محسوس ہوا۔ یہ تو پہلے ہی دیکھ چکے تھے کہ ہماری رہائش کے بالکل سامنے تھانہ واقع تھا۔ اس شور اور آگے پیچھے گاڑیوں کی آمد نے تشویش میں ڈال دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ہیں جو سامان ادھر سے ادھر لے جاتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کو

آوازیں دیتے تھے اور کبھی بھاری سامان کھینچتے تھے۔ نمازِ باجماعت ادا کر کے تجسس و تشویش کو رفع کرنے کے لیے جیسے ہی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ نظارہ غیر متوقع تھا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئیں۔

جاری ہے

* * * * *

سانحۂ ارتحال

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے بھتیجے حضرت مولانا مفتی محمود اشرف عثمانی صاحب ۲۷ فروری ۲۰۲۲ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کامل مغفرت فرمائیں اور ان کی قبر کو جنت کا باغ بنادیں۔

محمد عثمان خان
معاون قلم کار

امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۱)

ابتدائیہ

امام غزالی علیہ الرحمۃ اسلامی تاریخ کا وہ درخشاں ستارہ ہیں جس کی کرنیں چوتھی صدی ہجری کے وسط میں دنیاے اسلام میں نمودار ہوئیں۔امام نے اپنے فکر انگیز نظریات کے سبب مسلم دنیا پر وہ گہرے نقوش چھوڑے جو آج بھی اسلامی فلسفے، علم و حکمت، تصوف و روحانیت، معاشرتی اقدار اور اخلاقیات کی اصلاح کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اپنے دور میں موجود علمی مکاتب کے نظریات کا بغور مطالعہ کیا اور ان کے نظریات کے اِبطال اور اسلام کی جامعیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔آپ یقیناً اپنے دور کے نابغۂ روزگار اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔امام غزالی کے علمی وفکری کارناموں پر نظر ڈالنے سے پہلے ان کے حالاتِ زندگی پر بھی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور ان کے تجدیدی کارناموں کا احاطہ بھی لازم ہے۔کیوں کہ آپ کی شخصیت اور افکار کے اثرات آج بھی اسلامی فکر میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں جن سے معاشرتی اصلاح کا سبق لیا جاسکتا ہے۔ذیل میں ہم ان کی تصوف کی تصنیفی خدمات کا ایک مختصر ساخاکہ پیش کریں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ موجودہ دور میں آپ کی تعلیمات سے کس طرح رہنمائی لی جاسکتی ہے۔مولانا حنیف ندوی نے امام غزالی کا تعارف ان شاندار الفاظ میں پیش کیا ہے:”قانون و شریعت کے سانچوں پر اہلِ علم نے چار طریقوں پر غور کیا ہے۔ان میں فقہ، اصول، علم الکلام اور تصوف شامل ہیں۔’غزالی‘میں یہ چاروں صفات نہایت توازن اور اعتدال کے ساتھ موجود ہیں۔یہ بیک وقت فقیہ و اصولی بھی ہیں اور فلسفہ و تصوف کے ہوش مند شناور

بھی۔(۱) ہمارا اصل موضوع امام صاحب کی تصوف کی تصنیفی خدمات کو قارئین کے سامنے اجاگر کرنا ہے۔ امام صاحب کی تصوف پر بیش بہا خدمات ہیں۔ ہم اپنے موضوع کے پیشِ نظر خود کو امام صاحب کی تصوف کے موضوع پر تصانیف تک محدود رکھیں گے۔

تصنیفات

امام غزالی علیہ الرحمۃ کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے درس و تدریس کا کام بھی کیا، بادشاہوں کے دربار میں بھی علمی مباحث کا حصہ بنے اور اس سے بڑھ کر علمی میدان میں قلم سے اپنے رشتے کو مربوط رکھتے ہوئے بے شمار کتب تصنیف کیں اور اصلاح معاشرہ، اسلامی فلسفہ اور دیگر باطل خیالات و افکار کو موضوع بحث بنایا۔ امام غزالی نے اگرچہ عمر ۵۴-۵۵ برس پائی مگر آپ کی کتب کی تعداد کافی ہے۔ بعض مورخین نے آپ کی کتب کی تعداد ۹۹ بیان کی بعض نے ۷۸۔

ہم امام غزالی کی تصوف کی تصنیفی خدمات کو بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم نے اوّلاً علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ کی تحقیق کے مطابق امام صاحب کی تصوف و احسان کے موضوع پر تصنیفات کو لیا ہے۔(۳) مندرجہ ذیل فہرست میں اکثر کتب علامہ شبلی کے مطابق ہیں۔ لیکن امام غزالی کی تصانیف کے مطالعے کے دوران دیگر کتب سے ہم نے اس فہرست میں بھی کچھ ردو بدل کیا ہے۔

۱-احیاء العلوم	۲-کیمیاے سعادت	۳-المقصد الاقصیٰ	۴-آداب الاخلاق
۵-جواہر القرآن	۶-جواہر القدس فی حقیقۃ النفس	۷-مشکوٰۃ الانوار	۸-منہاج العابدین
۹-معراج السالکین	۱۰-نصیحۃ الملوک	۱۱-ایہاالولد	۱۲-بدایۃ الہدایۃ

مذکورہ بالا کتب میں سے اکثر ہمیں دستیاب ہوگئیں لیکن کچھ تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکیں۔ جو دستیاب ہوسکیں ان کتب کا خلاصہ اور اہم خصوصیات ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:

احیاء العلوم

امام غزالی کی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء علوم الدین دونوں موضوعات کی جامع ہے۔ اخلاق کے موضوع پر امام غزالی سے پہلے فلسفیانہ طرز پر بھی متعدّد کتابیں لکھی گئی تھیں اور مذہبی طرز پر بھی۔ فلسفیانہ طرز کی کتابوں میں یونانی حکما ارسطو اور جالینوس کی کتابوں کے عربی تراجم کے علاوہ ابونصر فارابی (م ۳۹۹ھ) کی آرائ المدینۃ الفاضلۃ، الشیخ الرئیس ابوعلی ابنِ سینا (م ۴۲۸ھ) کی کتاب البروالاثم اور ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) کی تہذیب الاخلاق اور مذہبی طرز کی کتابوں میں ابوطالب مکی (م ۳۸۶ھ) کی قوت القلوب اور راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ) کی الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کتابوں کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جو احیاء العلوم کے حصے میں آئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ امام غزالی کی یہ تصنیف دونوں طرزوں کی جامع ہے۔ احیاء العلوم کی تصنیف کے وقت امام غزالی علیہ الرحمۃ کے سامنے قدما کی یہ تمام تصانیف تھیں۔ اس کا کافی حصہ — جیسا کہ علامہ سبکی (م ۷۷۱ھ) نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے — قوت القلوب، رسالہ قشیریہ اور الذریعہ سے ماخوذ ہے۔ خاص طور سے احادیث وآثار کا تمام تر حصہ قوت القلوب سے لے لیا گیا ہے۔ لیکن علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں: ''ان تمام تصانیف کو احیاء العلوم سے وہی نسبت ہے جو قطرے کو گوہر سے، سنگ کو آبگینے سے اور کاسۂ سفالین کو جامِ جم سے ہے''۔ (۴) احیاء العلوم کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی متعدّد شرحیں اور تلخیصیں لکھی گئی ہیں۔ علامہ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے منہاج القاصدین کے نام سے اس کی شرح کی۔ ابن قیم (م ۷۵۱ھ) نے اس پر اعتراضات کیے تو قطب شعرانی (م ۹۷۳ھ) نے الاجوبۃ المرضیۃ کے نام سے اس کا جواب دیا۔ زین الدین عراقی (م ۸۰۶ھ) نے اس میں وارد احادیث کی تخریج کی اور ان کے شاگرد ابن حجر عسقلانی نے اس پر استدراک لکھا۔ مرتضیٰ زبیدی (م ۱۲۰۵ھ) نے دس جلدوں میں اس کی شرح لکھی۔ اسی طرح اس کی تلخیص کرنے والوں میں شمس الدین عجلونی (م ۸۱۳ھ) امام غزالی کے بھائی احمد بن محمد، شیخ محمد بن سعید یمنی، شیخ ابوزکریا یحیی، شیخ ابوالعباس احمد بن موسیٰ موصلی (م ۶۳۲ھ) اور حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) قابلِ ذکر ہیں۔ (حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ان کا تذکرہ کیا ہے)

احیاء العلوم چار حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ عبادات پر ہے۔ اس میں کتاب العلم، قواعد العقائد، اسرار الطہارۃ، اسرار الصلاۃ، اسرار الزکاۃ، اسرار الصیام، اسرار الحج، آداب تلاوۃ القرآن وغیرہ کی تفصیل ہے۔ دوسرے حصے میں عادات کا بیان ہے۔ اس میں آدابِ طعام، نکاح، احکامِ کسب، حلال و حرام، صحبت و عزلت، سفر، وجد و سماع، امر بالمعروف اور اخلاق النبوۃ کا بیان ہے۔ تیسرا حصہ مہلکات پر ہے۔ اس میں عجائب القلب، ریاضۃ النفس، آفات الشہوتین، آفات اللسان، آفات الغضب، ذمِّ دنیا، ذمِّ جاہ و ریا وغیرہ کی وضاحت کی ہے۔ چوتھا حصہ مُنجیات پر ہے۔ اس میں توبہ، صبر، شکر، فقر و زہد، توحید، توکل، محبت و شوق وغیرہ پر اظہارِ خیال ہے۔

احیاء العلوم کی تعریف و توصیف میں بڑے بڑے علما رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ یہاں صرف علامہ نووی علیہ الرحمۃ شارحِ صحیح مسلم کا مشہور جملہ نقل کر دینا کافی ہوگا۔ انھوں نے فرمایا: کَادَ اَنْ یَّکُوْنَ قُرآناً "قریب تھا کہ یہ قرآن کہلاتی"۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے: "ان کی غرض غالباً یہ ہے کہ جس طرح قرآن حکیم کے مطالب براہ راست ان کو متاثر کرتے ہیں اور جس طرح ان کے اندازِ بیان میں تصنع اور بناوٹ کا عنصر نہیں پایا جاتا، اسی طرح 'احیاء' کے مضامین عقل و ادراک کی موشگافیوں میں پڑے بغیر قلب میں جاگزیں ہوتے ہیں اور پڑھنے والے پر چھا جاتے ہیں"۔(۵)

علامہ شبلی نے احیاء العلوم کی پانچ خصوصیات بیان کی ہیں:(۶)

(۱) امام غزالی نے اس کتاب میں حکمت اور موعظت دونوں کو ساتھ ساتھ نبھایا ہے۔ جس مضمون کو بھی ادا کیا ہے، باوجود سہل پسندی، عام فہمی اور دل آویزی کے، فلسفہ و حکمت کے معیار سے کہیں نہیں اُترنے دیا۔

(۲) فلسفۂ اخلاق کے مسائل اس طرح بیان کیے ہیں کہ دقیق سے دقیق نکتے لطائف بن گئے ہیں۔ پڑھنے والا نہ صرف یہ کہ ان کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے، بلکہ اس کے دل پر کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ سر تا پا اثر میں ڈوب جاتا ہے۔

(۳) اخلاق کی تعلیم اختلافِ طبائع کے لحاظ سے دی ہے۔

(۴) معاشرت واخلاق کی بنیاد اگرچہ مذہب پر رکھی ہے، لیکن اس نکتے کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ شارع کے کون سے افعال رسالت کی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے معاشرت وعادت کی حیثیت سے۔

(۵) محاسنِ اخلاق بیان کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اخلاق کا پلّہ رہبانیت، افسردہ دلی اور پست ہمتی کی طرف جھکنے نہ پائے۔

جاری ہے

حواشی

۱) ندوی، محمد حنیف، تعلیمات غزالی، مطبوعہ ۲۰۱۹، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۱-۲

۲) نعمانی، علامہ شبلی، الغزالی، مطبوعہ ۱۹۹۲، کراچی، دارالاشاعت، ص ۳۴

۳) نعمانی، شبلی، الغزالی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، طبع ۲۰۰۸ء، ص: ۶۰

۴) ندوی، محمد حنیف، افکار غزالی، مطبوعہ ۲۰۱۵، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص ۸۸

۵) نعمانی، علامہ شبلی، الغزالی، مطبوعہ ۱۹۹۲، کراچی، دارالاشاعت، ص ۵۳-۴۶ بہ تلخیص

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

رخصتی سے قبل ولیمہ کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: آج کل شادی کی تقریب میں ولیمہ بھی کیا جارہا ہے، کہ نکاح والے دن ہی ولیمہ بھی کردیا جاتا ہے اور لڑکی اور لڑکے والے آدھا آدھا خرچہ برداشت کرلیتے ہیں، اس کا نام انھوں نے ”شلیمہ“ رکھا ہوا ہے۔ سوال یہ کہ کیا اس طرح آدھا آدھا خرچہ برداشت کرکے اس دن ولیمہ کرنا جائز ہوگا؟ نیز اگر پورا خرچہ لڑکے والے ہی برداشت کریں تب بھی کیا نکاح کے ساتھ اسی دن فوراً ولیمہ کرلینا شریعت میں جائز ہے؟

جواب: عام طور پر ولیمے کے نام سے جو کھانا کھلایا جاتا ہے اس کی تین صورتیں رائج ہیں: پہلی یہ کہ باقاعدہ نکاح کے انعقاد سے پہلے ہی کھانا کھلایا جائے، یہ بالاتفاق ولیمہ مسنونہ نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نکاح اور رخصتی یعنی زفاف کے بعد کھانا کھلایا جائے یہ بالاتفاق ولیمہ مسنونہ ہے اور ولیمے کا اصل مصداق اور افضل ترین صورت یہی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ باقاعدہ ایجاب وقبول کے ذریعے نکاح منعقد ہوجانے کے بعد اور رخصتی وزفاف سے پہلے کھانا کھلایا جائے، اس صورت کو بھی فقہائے کرام نے ولیمہ کہا۔ اس لیے نکاح کے بعد اور زفاف سے پہلے کوئی کھانا کھلائے تو اس سے بھی ولیمے کی سنت ادا ہوجائے گی اور ان شاء اللہ ثواب بھی ملے گا۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں لڑکے کے گھر والے ولیمے کی ان تین صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار کرسکتے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ ولیمہ کا پورا خرچہ لڑکا یا اس کے اہلِ خانہ ہی اٹھائیں، ولیمے کے اخراجات کا بوجھ لڑکی کے گھر والوں پر نہ ڈالیں کیونکہ لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے نکاح کے موقعے پر کھانے

کا انتظام کرنا مسنون نہیں۔

وقت الوليمة:اختلف الفقهاء في وقت الوليمة :فذهب الحنفية والمالكية في المشهور وابن تيمية إلى أن الوليمة تكون بعد الدخول- وقال الشافعية بأن وقت الوليمة الأفضل بعد الدخول ،وأن وقتها موسع من حين العقد فيدخل وقتها به-ويقرب من هذا الإتجاه ماقاله المرداوي الأولىٰ أن يقال وقت الاستحباب موسع من عقد النكاح إلى انتهاء أيام العرس لصحة الأخبار في هذا وهذا ،وكمال السرور بعد الدخول -ولكن جرت العادة بفعلها قبل الدخول يسير. وذهب الحنابلة والحنفية في قول والمالكية في قول كذلك إلى أنه تسن الوليمة عند العقد. ويرى بعض الحنفية أن الوليمة العرس تكون عند العقد وعند الدخول(الموسوعة الفقهية الكويتية، حرف الواو، وليمة، إجابة الدعوة إلى الوليمة، الشروط المعتبرة في الوليمة نفسها، ثانيا: وقت الوليمة)

* * * * *

تبسم فاطمہ
معاون قلم کارہ

سیرت النبی ﷺ پر چند غیر منقوط کتب

اسلامی تاریخ میں سیرت نگاروں نے، محدثین نے، تاریخ دانوں نے حضور اکرم ﷺ کی شان میں بہت ساری کتب لکھی ہیں۔ اس خاص فن میں عقیدت مندوں نے کچھ ایسی کتب تحریر کیں جن میں آقائے دو جہاں ﷺ سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے غیر منقوط کتب تحریر کی۔ غیر منقوط کے معنی ہے بغیر نقطے والے حروف یا عبارت۔ یہ ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں نقطے والے حروف سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ یہ بہت مشکل اور مہارت و ذہانت کا کام ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہر ایک لفظ، جملے، پیراگراف کے لیے بہت سا وقت لگتا ہے کیونکہ اردو زبان میں کل ۵۴ حروف ہیں جن میں سے ۲۵ حروف ایسے ہیں جن میں نقطہ نہیں آتا یعنی آدھی اردو زبان ہے اس لیے بہت مشکل ہوتا ہے ایک فقرے میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جن میں نقطہ نہ آتا ہو اور فقرے کا مفہوم بھی سلامت رہے۔ ہمیں نقطے والے حروف تو بہت مل جاتے ہیں جیسا کہ طاقت کے بدلے بل، تاب، زور، قوت اور قدرت پر ان کے بدلے کوئی ایک غیر منقوط لفظ تلاش کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ جن مصنفین نے اس صنعت میں اپنے جوہر دکھائے، یہ ان کا بہت بڑا امتیاز ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص وہ مصنفین جنھوں نے ساری محبت و عقیدت کا اظہار اس خاص و افضل ہستی، دو جہاں کے والی، اعلیٰ سیرت و کردار، نورِ انوار حضرت محمد ﷺ کے لیے کیا، جن کے لیے اللہ رب العزت نے دو جہاں بنائے، یہ دنیا بنائی۔ ایسے ہی کچھ مصنفین کا ذیل میں ذکر ہے جنھوں نے سیرت النبی ﷺ پر غیر منقوط کتب لکھ کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

ہادیٔ عالم ﷺ

اردو سیرت کی سب سے پہلی غیر منقوط کتاب "ہادیٔ عالم" ہے۔اس کتاب میں سب الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جن میں نقطہ نہیں ہے۔اس کتاب کے مصنف محمد ولی رازی ہیں۔ہادیٔ عالم چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ایسی تحقیقی کتاب کی مثال اردو تو اردو، عربی اور فارسی میں بھی نہیں مل سکتی۔محمد ولی رازی کی یہ تصنیف اگر معجزہ نہیں تو ادبی کرامت تو ضرور ہے۔اس کتاب کو ۱۹۸۳ء میں حکومتِ پاکستان کے منعقد کردہ مقابلے میں اول انعام سے بھی نوازا جا چکا ہے جس کے متعلق مولانا زاہد الراشدی صاحب کا کہنا ہے کہ اس انعام پر ہماری رائے بھی وہی ہے جو ایک دوست کے حوالے سے ہم نے پڑھی ہے، مصنف کے اعزاز میں کوئی اضافہ ہوا ہے یا نہیں البتہ صدارتی ایوارڈ کی عزت و وقار میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔تصنیف کا سال ۱۹۸۲ء ہے۔اس کا آغاز ایک غیر منقوط نعت سے کیا گیا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ

اس کتاب کے مصنف محمد یاسین سروہی ہیں۔یہ کتاب بھی غیر منقوط ہے۔یہ کتاب ۵۴۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔یہ کتاب مشتاق بک کارنر لاہور سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔اس میں مصنف نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ بھی غیر منقوط کیا ہے۔

داعیٔ اسلام

یہ بھی غیر منقوط کتاب ہے جو سیرت النبی ﷺ پر لکھی گئی ہے۔اس کتاب کے مصنف صادق علی انصاری قاسمی دریابادی بستوی ہیں۔ان کی عمر تقریباً بیاسی برس تھی۔صادق علی انصاری قاسمی دریابادی بستوی کی ولادت ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کے ضلع سنت کبیر نگر میں ہوئی۔آپ کا تعلق ایک غریب کنبے سے تھا۔آپ نے بہت سی کتب تصنیف کیں۔داعیٔ اسلام کے نام سے آپ نے ایک غیر منقوط کتاب لکھی۔اس میں تقریبا ۲۰۰ صفحات

ہیں۔آپ کو غیر منقوط کتاب لکھنے کا شوق محمد ولی رازی صاحب کی کتاب ''ہادیٔ عالم'' سے ہوا۔ داعیٔ اسلام کتاب ۱۹۸۵-۸۶ء کی تصنیف ہے۔آپ کی وفات ۱۵ دسمبر ۲۰۱۸ء میں ہوئی۔

سرکارِ دوعالم ﷺ

یہ کتاب سیّد تابش الوری صاحب کی تصنیف ہے۔آپ کا اصل نام سید سردار علی ہے۔یہ کتاب مجلسِ ثقافت پاکستان بہاولپور سے اپریل ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں ۱۰۶ صفحات ہیں۔اس کتاب کو ۲۰۰۵ء میں سیرت النبی ﷺ کے انعام کا مستحق بھی سمجھا گیا۔

سرون کے سودے

اس کتاب کے مصنف ابو سلمان مولانا ڈاکٹر شمس الہدیٰ ربانی ہیں۔یہ کتاب ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔۲۰۰۴ء سے ۲۰۰۵ء کے درمیان مکمل ہوئی اور ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔

سیرت پر رکھی گئیں ان جیسی دیگر کتب ارشادِ خداوندی ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ ''اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کردیا'' کا مظہر ہیں،اور یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا۔ان شاء اللہ

* * * * *

احمد جاویدؔ

معروف شاعر، نقاد اور دانشور

غزل

تھا جانبِ دل صُبح دم وہ خوش خِرام آیا ہوا
آدھا قدم سوے گریز اور نیم گام آیا ہوا

رقص اور پاکُوبی کروں، لازم ہے مجذوبی کروں
دیکھو تو ہے میرا صنم، میرا امام آیا ہوا

دریاے درویشی کے بیچ، طوفانِ بے خویشی کے بیچ
وہ گوہرِ سیراب، وہ صاحِبِ مقام آیا ہوا

اے دل بتا! اے چشم کہہ! یہ روے دل بر ہی تو ہے
یا ماہ؛ چرخِ ہفت میں بالاے بام آیا ہوا

ہے ذرّہ ذرّہ پُر صدا، اہلا و سہلاً مرحبا
کیا سر زمینِ دل پہ ہے وہ آج شام آیا ہوا

تجھ پر پڑی یہ کس کی چُھوٹ، اے چشمِ حیراں کچھ تو پھوٹ
کیا حدِّ بینائی میں ہے وہ غیبؒ فام آیا ہوا

لرزاں ہے دل میں راز سا، شعلہ قدیم آوام سا
یا لالۂ خاموش پر رنگِ دوام آیا ہوا

ہے موسمِ دیوانگی، پھر چاک ایجاد مری
لوٹا رہے ہیں پہلے کا خیاط کام آیا ہوا

میری طرف سے اے عزیز، دل میں نہ رکھنا کوئی چیز
پھرتے بھی دیکھا ہے کہیں صاحِبؒ غلام آیا ہوا

خورشید سامانی تری اور ذرہ دامانی مری
ہے عجوبہ دیکھنے ہر خاص و عام آیا ہوا

اک گرد اڑی صحرا سمیت، اک موج اٹھی دریا سمیت
دنیاے خاک و آب میں تھا کوئی شام آیا ہوا

یک عمر رفتاری کے ساتھ، یک ماہ سیّاری کے ساتھ
یک چرخ دوّاری کے ساتھ، گردش میں جام آیا ہوا

صد چشم بیداری کے ساتھ، صد سینہ سرشاری کے ساتھ
سو سو طرح شہبازِ دل ہے زیرِ دام آیا ہوا

*****